چہارم

قصص القرآن

حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی

بسم اللہ الرحمٰن

قصص القرآن

جلد چہارم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے واقعات و حالات کا مبصرانہ اور محققانہ بیان

تالیف
مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ

فہرست مضامین قصص القرآن جلد چہارم

مضمون	صفحہ
دیباچہ طبع ثانی	۷
طبع ثالث	۹
طبع جدید آفسیٹ (عکسی)	۱۰
پیش لفظ	۱۱
حضرت عیسیٰ (علیہ السلام)	۱۴
قرآن عزیز اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام	
عمران وحنہ	۱۷
مریم علیہا السلام کی ولادت	۱۸
حنہ اور ایشاع	۲۱
مریم علیہا السلام کا زہد و تقویٰ	۲۲
مقبولیتِ خداوندی	۲۲
کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟	۲۴
نبوۃ النساء اور ابن حزم	۲۷
کیا حضرت مریمؑ نبی ہیں؟	۳۴
آیت وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ کا مطلب	〃
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بشاراتِ کتبِ سابقہ	۳۶
ولادتِ مبارک	۴۰
بشاراتِ ولادت	۴۷
حلیۂ مبارک	۴۹
بعثت و رسالت	〃
آیاتِ بینات	۵۳
لائقِ توجہ بات اور	۵۷
حقیقتِ معجزات	
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور	۷۶
اُن کی تعلیم کا خلاصہ	
حواریِ عیسیٰ علیہ السلام	۷۸
حواریِ عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن و انجیل کا موازنہ	۸۰
نزولِ مائدہ	۸۴
"رفع الی السماء" یعنی زندہ آسمان پر اُٹھا لیا جانا	۸۹
قادیانی تلبیس اور اُس کا جواب	۱۰۸
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفعِ سماوی اور چند جذباتی باتیں	۱۲۳
وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر	۱۲۵

مضمون	صفحہ
حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام	۱۲۷
لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ	۱۲۸
حیات و نزولِ عیسیٰ علیہ السلام اور احادیثِ صحیحہ	۱۳۵
حیات و نزولِ مسیحؑ کی حکمت	۱۴۴
واقعاتِ نزول، صحیح احادیث کی روشنی میں	۱۵۶
وفاتِ مسیح علیہ السلام	۱۵۸
وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا	۱۵۹
فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ	۱۶۸
حضرتِ مسیحؑ کی دعوتِ اصلاح اور بنی اسرائیل کے فرقے	۱۷۲
اناجیلِ اربعہ	۱۷۴
قرآن اور انجیل	۱۸۲
انجیل اور حواریِ عیسیٰؑ	۱۸۶
حضرتِ مسیحؑ علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت	۱۸۷
تثلیث	۱۸۸
باپ	۱۹۳
بیٹا	۱۹۳
روح القدس	۱۹۳
ازسنہ مظلمہ اور اصلاحِ کنیسہ کی آواز	۱۹۶
قرآن اور عقیدۂ تثلیث	۱۹۹
حضرتِ مسیحؑ خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسول ہیں	۲۰۰
حضرتِ مسیحؑ نہ خدا ہیں اور نہ خدا کے بیٹے	۲۰۱
لائقِ توجہ بات	۲۰۷
کفارہ	〃
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم	۲۱۰
محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن	۲۱۰
بشاراتُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۲۱۷
تورات اور بشارات	۲۲۵
صبحِ سعادت	۲۴۹
تاریخِ ولادت کی تحقیق	۲۵۳
نسبِ مبارک	۲۵۴
یتیمی	۲۵۹
بُت پرستی سے نفرت، خلوت پسندی اور عبادتِ الٰہی کا ذوق	۲۶۲
حقیقتِ وحی	۲۶۴
صاحبِ وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل	۲۷۹
بعثت	۲۸۳
حدیثِ بخاری اور بعض مستشرقین کی کوتاہ اندیشی	۲۸۶
بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق	۲۸۹
نبی اور مصلح	۲۹۷
کیفیتِ وحی	۳۰۳
کیفیتِ وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی	۳۰۷

مضمون	صفحہ
نزولِ وحی کا پہلا دور	۳۰۸
نزولِ وحی کا دوسرا دور	۳۰۹
اعلانِ دعوت وارشاد کی پہلی منزل	۳۱۱
دعوتِ ارشاد کی دوسری منزل	۳۱۳
بعثتِ عامّہ	۳۱۴
دعوتِ اسلام کا مجمل خاکہ اور حضرت جعفرؓ کی تقریر	۳۱۵
قرآن اور تجدیدِ دعوت	۳۱۷
توحید	۳۲۰
رسالت	۳۲۳
یومِ آخرت	۳۲۶
اِسراء (معراج)	۳۳۲
واقعہ کی وحدت	۳۳۲
تحقیقِ تاریخ وسنہ	۳۳۳
قرآنِ عزیز اور واقعۂ معراج	۳۳۴
احادیث اور واقعۂ معراج کا ثبوت	۳۳۵
واقعہ کی نوعیت	۳۳۵
واقعۂ معراج واسراء اور قرآنِ عزیز	۳۳۶
سورۂ بنی اسرائیل اور واقعۂ معراج	۳۳۷
والنجم اور واقعۂ معراج	۳۴۷
واقعہ کی تفصیلات	۳۵۱
معراج میں رویتِ باری	۳۵۵
ہجرت	۳۵۶
ہجرتِ حبش	″
ہجرتِ مدینہ کے اسباب	۳۵۷
ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	۳۵۹
دارالندوہ	۳۵۹
قرآنِ عزیز اور ہجرتِ مدینہ	۳۶۳
ہجرت ؟	″
ختمِ نبوت	۳۶۶
غزوات	۳۸۸
غزوۂ بدر	″
غزوہ	″
بدر	۳۸۸
واقعہ	″
دعائے نصرت	۳۹۸
غیبی نصرت وامداد	″
نتیجۂ جنگ	۳۹۹
جنگِ بدر نے تاریخِ عالم کا رُخ بدل دیا	۴۰۰
قرآنِ عزیز کی روشنی میں	۴۰۲
غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر	
غزوۂ اُحد	۴۳۰
اُحد	″
غزوۂ اُحد	″
حضرت حمزہ کی شہادت	۴۳۴
قرآنِ عزیز اور غزوۂ اُحد	۴۳۵
غزوۂ احزاب (غزوۂ خندق)	۴۳۷
قرآنِ عزیز اور غزوۂ احزاب	۴۴۰
واقعۂ حدیبیہ	۴۴۲
بیعتِ رضوان	۴۴۴
معاہدۂ صلح	۴۴۵

مضمون	صفحہ
الفتح الاعظم	۴۴۹
حاطب بن بلتعہ کا واقعہ	۴۵۱
بُت شکنی	۴۵۵
رحمۃ للعالمین کی شان	۴۵۶
خطبہ	۴۵۸
فتح مکہ اور قرآن عزیز	〃
غزوۂ حُنین	۴۶۱
غزوۂ حنین اور قرآن حکیم	۴۶۳
غزوۂ تبوک اور قبولِ توبہ	۴۶۵
کا عجیب واقعہ	
مالی استعانت	۴۶۶
عذر خواہی	۴۶۷
معاشرتی مقاطعہ	〃
ضبط و نظم کی	۴۶۸
عدیم النظیر مثال	

مضمون	صفحہ
عشقِ رسول اور صداقتِ	۴۶۹
اسلام کا حیرت انگیز معیار	
قبولِ توبہ اور سورۂ توبہ	۴۷۲
قرآن عزیز اور غزوۂ تبوک	۴۷۳
اہم غزوات	۴۷۴
اور نتائج و بصائر	
بدر الکبریٰ	۴۷۴
اُحُد	۴۷۵
غزوۂ احزاب	۴۷۷
صلح حدیبیہ	۴۷۹
فتح مکہ	۴۸۰
حُنین	۴۸۲
تبوک	〃
تبنّی	۴۸۴
حضرت زید رضی اللہ عنہ	〃

مضمون	صفحہ
انسدادِ تبنّی	۴۸۷
خرافی داستان	۴۹۰
بصائر	۴۹۴
بنو نضیر	〃
قرآن عزیز اور بنو نضیر	۴۹۹
بصیرت	〃
واقعۂ اِفک	۵۰۱
موعظت	۵۰۵
نباءِ فاسق	۵۰۷
موعظت	۵۰۹
مسجدِ ضرار	۵۱۱
موعظت	۵۱۳
وفات یا وصل	۵۱۵
بالرفیق الاعلیٰ	
عبرت و موعظت	۵۲۰

دیباچۂ طبع ثانی

اللہ رب العزت کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے کہ اُس نے آج قصص القرآن کی چوتھی جلد کے دوسرے ایڈیشن کو شائقین کی خدمت میں پیش کرنے کا موقع عطا فرمایا۔

بلاشبہ یہ مؤلف کی اپنی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے کہ یہ کتاب بحمداللہ مقبولِ خاص وعام ہوئی بلکہ یہ تو قرآنِ حکیم کا اپنا معجزہ ہے کہ ایک سطر یا ایک لفظ بھی اس کی سچی خدمت سے اگر وابستہ ہوجائے تو وہ لفظ اور وہ سطر بھی مخدوم ومقبول بن جاتی ہے۔

پہلا ایڈیشن جب طبع ہوکر سامنے آیا تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ کافی کنج وکاؤ کے باوجود "ختمِ نبوت" کے اہم عنوان سے کتاب خالی ہے ـــــ بار بار غور کیا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ عنوان کی اہمیت کس طرح نظر انداز ہوگئی۔ یہ کمی ایسی نہ تھی جو قلب کو خلش سے آزاد کرسکتی، اس لیے ایڈیشن کے ختم ہونے کا بے چینی کے ساتھ انتظار رہا، اور اب بحمداللہ نقشِ ثانی میں اس کی تلافی کرسکا۔ فالحمدُ للہ علیٰ ذٰلک۔

۴۔ ستمبر ۴۷ء کے خونی حادثہ نے ندوۃ المصنفین کو بھی بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں لیے بغیر نہ چھوڑا اور تقریباً پونے دو لاکھ قیمت کے بہترین علمی اسٹاک کو نذرِ آتش کردیا گیا۔

اب نہ وہ قمرِ دل باغ کی خاموش فضاء ہے اور نہ قلب ودماغ کو پہلا سا سکون

نصیب ـــــ ایک قرول باغ اور ندوۃ المصنفین کا بہترین آفس ہی کیا سرے سے وہ دِلّی ہی نہ رہی، اب تو اِس "مرحوم دلّی" کا ذِکر افسانوں ہی میں سُنیے گا۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ دلّی پھر "دلّی" ہے۔ شاید مرتبہ اُجڑ کر بھی نئی بہار کے ساتھ اپنا جوبن دکھا رہی ہے ـــ خدا اس کو نظرِ بد سے بچائے۔

بہرحال اِس نازک اور ناسازگار ماحول کے باوجود قصص القرآن جلد رابع کا دوسرا ایڈیشن طبع ہو کر آپ کو دعوتِ مطالعہ دے رہا ہے۔ اب آپ کا علمی و دینی فرض ہے کہ اس قیمتی ادارہ کو اس قابل بنائیں کہ وہ سابق کی طرح آج بھی علمی، ادبی اور دینی خدمات انجام دیتا رہے اور دُنیا کی نئی ترقیوں کے ساتھ وہ بھی عروج کی آخری منزل تک پہنچ سکے۔ واللہ غالبٌ علیٰ امرہٖ۔

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی کان اللہ لہٗ

۲۱۔ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ

طبعِ سوم

کتاب کا دوسرا ایڈیشن ختم ہوگیا، لیکن نظرِ ثانی کا موقع نہ مل سکا، اور یہ تیسرا ایڈیشن نظرِ ثانی کے بغیر ہی شائع ہو رہا ہے۔ طبعِ دوم میں ایک اہم باب "ختمِ نبوت" کے اضافہ کے بعد یوں بھی یہ ایڈیشن نظرِ ثانی کا زیادہ محتاج نہ تھا، پھر بھی انسانی جدوجہد کسی وقت بھی مکمل نہیں کہی جا سکتی ـــــ موقع میسر آیا تو طبعِ چہارم کے وقت نظرِ ثانی ہو سکے گی۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۳۱ر اکتوبر ۵۵ء

دیباچہ طبعِ عکسی

شکر ہے سالہا سال کے انتظار اور کاوش کے بعد قصص القرآن جلد چہارم کا بھی عکسی ایڈیشن تیار ہوگیا ہے اور اس طرح کتاب کی چاروں جلدیں ایک ہی رنگ اور ایک ہی معیار پر آگئی ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ "قصص القرآن" "ندوۃ المصنفین" کی نہایت اہم اور مقبول ترین کتاب ہے اور اپنے مضامین کی افادیت، ندرت اور اثر انگیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ پوری کتاب کے کم و بیش اٹھارہ سو صفحات ہیں، ان صفحات میں قرآن کریم

کے بیانات کی روشنی میں انبیائے کرام علیہم السلام کی ایمان افروز زندگی کے واقعات و حالات سادہ اور پُراثر پیرایے میں تحریر کیے گئے ہیں۔

یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ "قصص القرآن" کے درجے کی کوئی کتاب دُنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے جس میں قصصِ قرآنی اور پیغمبرانِ حق کی تاریخ اتنی تفصیل و تحقیق سے بیان کی گئی ہو۔

قدرتی طور پر جی چاہتا تھا کہ اس لاجواب کتاب کی طباعت بھی اس کی شان اور مرتبے کے مطابق ہوتی، الحمدللہ یہ آرزو پُوری ہوگئی اور چاروں جلدیں نفیس کتابت کے زیور سے آراستہ ہوکر آفسٹ پر چھپ گئیں۔

"ندوۃ المصنفین" کے وسائل نہایت ہی محدود ہیں اور اس کے لیے گرانی کی شدت کے اِس دور میں اتنی ضخیم کتاب کی اشاعت جتنی کچھ دشوار ہوسکتی ہے اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔

دعا ہے خواص اور عوام، قدیم تعلیم یافتہ اور جدید طالبانِ علم سب ہی بقدرِ ظرف و ہمت اِس سے پُورا پورا فیض حاصل کریں۔

ضرورت ہے کہ موعظت و عبرت کے اس دفتر کا ایڈیشن عربی میں بھی شائع ہو اور انگریزی میں بھی، دیکھیے اس کی نوبت کب آتی ہے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۲۷ جمادی الآخر ۱۳۹۹ھ

مطابق ۲۴ مئی ۱۹۷۹ء

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعَالَمِیْنَ نَذِیْرًا۔
والصلوٰۃ والسلام علی محمدن المبعوث کافۃ للناس بشیرا ونذیرا۔
امابعد خدائے تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ آج قصص القرآن کی تالیف اپنی آخری منزل پر پہنچ کر کامیابی کے ساتھ مکمل ہوگئی، میں کیا اور میری لیاقت اور میرا قلم کیا؟ یہ جو کچھ بھی ہوا خدا کے فضل اور قرآنِ حکیم کی برکت کی بدولت ہوا۔
فالحمدُ للہِ علےٰ ذٰلک۔

یہ جلد حضرتِ عیسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت و دعوت اور حیوٰۃِ طیبہ اور دیگر مباحثِ متعلقہ پر مشتمل، اور پہلی تین جلدوں کی خصوصیات و امتیازات کی حامل ہے۔

حضرتِ عیسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے مقدس حالات میں خصوصیت کے ساتھ وہ مباحث لائقِ مراجعت ہیں جو قرآنِ حکیم کے حکیمانہ دلائل و براہین کی روشنی میں "حیوٰۃِ عیسیٰ علیہ السلام" سے متعلق ہیں یا عہدِ قدیم و عہدِ جدید (توراۃ و انجیل) کے مضامینِ الٰہیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی "حیاتِ طیبہ" تو وہ مخدوم شے ہے کہ از سلف تا خلف مسلسل ہر زندہ زبان اس خدمتِ پاک کو اپنا فرض یقین کرتی اور اداء فرض سے سبکدوشی کا شرف حاصل کرتی رہی ہے۔ خصوصاً عربی زبان کے بعد اُردو زبان میں اس خدمت نے بہترین ذخیرہ پیش کر دیا ہے۔ اور مختصر، متوسط مطوّل ہر نوع کی تالیفات اس سلسلہ میں موجود ہیں اس لیے اس تالیف میں کوشش کی گئی ہے کہ صرف ان ہی واقعات کو سپردِ قلم کیا جائے جن کا قرآنِ حکیم سے براہِ راست تعلق ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر شعبۂ حیات قرآنِ حکیم کی جیتی جاگتی تصویر، اور آپؐ کا ہر اُسوۂ حسنہ آیاتِ قرآن کی تفسیر ہے۔

قصص القرآن کی تالیف اپنی افادیت اور مقصدِ تالیف کے لحاظ سے کیا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا فیصلہ اربابِ ذوق کی نگاہِ بصیرت کے سپرد ہے ——— خدائے تعالیٰ سے دست بدعاء ہوں کہ وہ اس خدمت کو قبول فرمائے۔ وما توفیقی الا باللہ وھو حسبی ونعم الوکیل۔

خادمِ ملت

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی کان اللہ لہٗ

۹ صفر المظفر ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۴۶ء

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام)

قرآن اور حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) - عمران وحنہ - مریم علیہا السلام کی ولادت - حنہ اور ایشاع (الیشع) - مریم (علیہا السلام) کا زہد وتقویٰ - مقبولیتِ خداوندی - کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ - نبوت النساء اور ابن حزم - آیت "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام اور بشاراتِ کتبِ سابقہ - ولادتِ مبارک - بشاراتِ ولادت - حُلیۂ مبارک - بعثت ورسالت - آیاتِ بینات لائقِ توجہ بات اور حقیقتِ معجزات - حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کی تعلیمات کا خلاصہ - حوارئ عیسیٰ (علیہ السلام) - حوارئ عیسیٰ (علیہ السلام) اور قرآن وانجیل کا موازنہ - نزولِ مائدہ - رفع الی السماء یعنی زندہ آسمان پر اُٹھا لیا جانا - قادیانی تلبیس اور اُس کا جواب - حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کا رفعِ سماوی اور چند جذباتی باتیں - کادیانی کی ایک کذب بیانی - حیاتِ عیسیٰ (علیہ السلام) - لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ - تفسیر بالرائے کی نمایاں مثال - وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ - مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ - وَرَافِعُكَ اِلَيَّ - حیاتِ عیسیٰ (علیہ السلام) اور احادیثِ صحیحہ - احادیثِ حیات ونزول - حیاتِ مسیح اور اجماعِ امت - حیات ونزولِ مسیح کی حکمت - واقعاتِ نزول صحیح احادیث کی روشنی میں - وفاتِ مسیح (علیہ السلام)

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ۔ نبیِ صادق و متنبیِ کاذب۔ حضرتِ مسیحؑ کی دعوتِ اصلاح۔ بنی اسرائیل کے فرقے۔ اناجیلِ اربعہ۔ قرآن اور انجیل۔ انجیل اور حواریِ عیسیٰ علیہ السلام۔ حضرتِ مسیحؑ اور موجودہ مسیحیت۔ تثلیث؟ باپ بیٹا، روح القدس ازمنۂ مظلمہ اور اصلاحِ کلیسہ کی آواز۔ حضرتِ مسیحؑ خدا کے مُقرب رسول ہیں۔ حضرتِ مسیح نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے۔ لائقِ توجہ بات۔ کفارہ؟

قرآنِ عزیز اور حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں، اور جس طرح نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) خاتم الانبیاء و رسل ہیں اُسی طرح عیسیٰ (علیہ السلام) خاتم الانبیاءِ بنی اسرائیل ہیں، اور جمہور کا اِس پر اجماع ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا، اور درمیان کا یہ زمانہ جس کی مدت تقریباً پانچ سو ستّر سال ہے۔ فترۃ (انقطاعِ وحی) کا زمانہ رہا ہے۔

عیسیٰ (علیہ السلام) کی جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کا ایک امتیازی نشان یہ بھی ہے کہ اگر انبیاءِ بنی اسرائیل میں حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کو نبوت و رسالت کا مقامِ امامت حاصل ہے تو عیسیٰ (علیہ السلام) مجددِ انبیاءِ بنی اسرائیل ہیں، اس لیے کہ قانونِ ربانی (تورات) کے بعد بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے انجیل (بائبل) سے زیادہ عظیم المرتبہ دوسری کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انجیل کا نزول قانونِ تورات کی تکمیل ہی کی شکل میں ہوا ہے یعنی نزولِ تورات کے بعد یہود نے جو قسم قسم کی گمراہیاں دینِ حق میں پیدا کرلی تھیں انجیل نے توراۃ کی شارح بن کر بنی اسرائیل کو ان گمراہیوں سے بچنے کی دعوت دی اور اس طرح تکمیلِ تورات کا فرض انجام دیا اور بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ کا فراموش شدہ پیغامِ ہدایت عیسیٰ (علیہ السلام) ہی نے

دوبارہ یاد دلایا اور تازہ بارانِ رحمت کے ذریعہ اس خشک کھیتی کو دوبارہ زندگی بخشی۔
مزید برآں یہ کہ عیسیٰ (علیہ السلام) سرورِ کائنات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب سے بڑے منادا اور مبشر ہیں اور ہر دو مقدس پیغمبروں کے درمیان ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں میں خاص رابطہ اور علاقہ پایا جاتا ہے۔[1]

قرآن عزیز نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مماثلت کے سلسلہ میں جن پاک ہستیوں کے واقعات سے بہت زیادہ بحث کی ہے اُن میں حضرتِ ابراہیم، حضرتِ موسیٰ اور حضرتِ عیسیٰ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی مقدس ہستیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

حضرتِ ابراہیمؑ کی شخصیت قرآن کے "تذکیر بایام اللہ" میں اس لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ جس دینِ قویم اور ملتِ بیضاء کا عروج و کمال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تقدیس کے ساتھ وابستہ تھا اور جس ملت کی دعوت و تبلیغ کا محور و مرکز ذاتِ اقدس بننے والی تھی وہ ملتِ ابراہیمؑ کے نام سے موسوم ہے "مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ" کیونکہ یہی وہ بوڑھے پیغمبر ہیں جنھوں نے شرک کے مقابلہ میں سب سے پہلے توحیدِ الٰہی کو حنیفیت کا لقب دیا اور آئندہ ہمیشہ کے لیے خدا کی راہِ مستقیم کے لیے "ملّۃ حنیفیۃ" کا امتیاز قائم کر دیا یعنی جو خدا کی پرستش کے لیے مظاہرِ کائنات کی پرستش کو وسیلہ بناتا ہے وہ "مشرک" ہے اور جو خالقِ کائنات کی یکتائی کا قائل ہو کر براہِ راست اُسی کی پرستش کرتا ہے وہ "حنیف" ہے۔ پس اس مقدس پیغمبر نے خدا پرستی کے اس حقیقی تصور کو عملی حیثیت میں اس درجہ نمایاں کیا کہ مستقبل میں ادیانِ حق کے لیے اُس کی پیروی حق و صداقت کا معیار بن گئی اور خدائے برتر کی جانب سے قبولیت کا یہ شرف عطا ہوا کہ یہ مقدس پیغمبر کائناتِ رشد و ہدایت کا امامِ اکبر اور مجددِ اعظم قرار پا گیا: "وَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا" اور پیروی کرو ابراہیم کی ملت کی جو سب سے کٹ کر صرف خدا کی جانب جھکنے والا ہے:۔

---

[1] تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ ھُوَ	یہ ملت ہے تمہارے باپ ابراہیم کی، اس نے
سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ	تمہارا نام "مسلم" رکھا نزولِ قرآن سے قبل اور اس
وَفِیْ ھٰذَا۔ (سورۂ حج پ ۱۷ ع)	قرآن میں بھی تمہارا نام "مُسلِم" ہے۔

اور موسیٰ (علیہ السلام) کی مقدس زندگی کا تذکرہ اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ اُن کی دعوت و تبلیغ کے واقعات یعنی قوم کی جہالت و نافرمانی، دشمنانِ خدا سے نبرد آزمائی، پیہم مصائب و آلام پر صبر و استقلال کا دوام و ثبات، اور اسی قسم کے دوسرے کوائف و حالات میں اُن کے اور نبیِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان بہت زیادہ مشابہت و مناسبت پائی جاتی ہے اور اس لیے وہ واقعات و حالات، قبول و انکارِ حق اور اُن سے پیدا شدہ نتائج کے سلسلہ میں بصیرت و عبرت کا سامان مہیا کرتے اور نظائر و شواہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اور عیسیٰ (علیہ السلام) کی حیاتِ طیبہ کا مقدس ذکر مسطورۂ بالا خصوصیات و امتیازات کی بناء پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔

غرض قرآنِ عزیز نے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے حالات و واقعات کو بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اُن کی حیاتِ طیبہ کے دیباچہ کے طور پر اُن کی والدہ حضرت مریم (علیہا السلام) کے واقعاتِ زندگی کو بھی روشن کیا ہے تاکہ قرآن کا مقصد "تذکیر بایام اللہ" پورا ہو۔

یہ ذکرِ پاک قرآنِ عزیز کی تیرہ سورتوں میں ہوا ہے، ان میں سے کسی جگہ نامِ مبارک عیسیٰ (یسوع) سے یاد کیا گیا ہے اور کسی جگہ "مسیح" اور عبداللہ کے لقب سے اور کسی مقام پر کُنیت "ابن مریم" کے اظہار کے ساتھ۔

نقشۂ ذیل اس حقیقت کا کاشف اور اربابِ مطالعہ کی بصیرت کے لیے مُمِدّ و معاون ہے:۔

لہ مُسلم اور حنیف مفہوم میں متحد ہیں مُسلم خدا کا تابعدار اور حنیف سب سے مُنہ پھیر کر صرف خُدا کا ہو جانے والا۔

شمار	سورۃ	آیات	عیسیٰ	مسیح	عبداللہ	ابن مریم	تعداد آیات
۱	البقرۃ	۸۶-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۲۵۳	۳	۰	۰	۲	۵
۲	آل عمران	۴۲-۶۴-۸۴	۵	۱	۰	۱	۲۴
۳	النسآء	۱۵۶-۱۵۹-۱۷۱-۱۷۲	۳	۳	۰	۲	۶
۴	المائدۃ	۱۷-۴۶-۷۲-۷۵-۷۸-۱۱۰-۱۲۰	۶	۵	۰	۱۰	۱۸
۵	الانعام	۸۵	۱	۰	۰	۰	۱
۶	التوبہ	۲۰-۳۱	۰	۱	۰	۱	۲
۷	مریم	۱۶-۳۵	۱	۱	۱	۶	۱۹
۸	المؤمنون	۵۰	۱	۰	۰	۱	۱
۹	الاحزاب	۷-۸	۱	۰	۰	۱	۲
۱۰	الشوریٰ	۱۳	۱	۰	۰	۰	۱
۱۱	الزخرف	۵۷-۶۳	۱	۰	۰	۱	۲
۱۲	الحدید	۲۷	۱	۰	۰	۱	۱
۱۳	الصف	۶-۱۴	۲	۰	۰	۲	۲

عمران وحنہ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ (علیہما السلام) کے حالات میں گذر چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں عمران ایک عابد و زاہد شخص تھے اور اسی زہد و عبادت کی وجہ سے نماز کی امامت بھی اُن ہی کے سپرد تھی اور اُن کی بیوی حنہ بھی بہت پارسا اور عابدہ تھیں اور اپنی نیکی کی وجہ سے وہ دونوں بنی اسرائیل میں بہت زیادہ محبوب و مقبول تھے [1]

محمد بن اسحٰق صاحبِ مغازی نے عمران کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:-

عمران بن یاشم بن میشا بن حزقیا بن ابراہیم بن عزریا بن ناوش بن اجر بن ہوا بن نازم بن مقاسط بن ایشا بن ایاز بن رخیم (رخیعام) بن سلیمان بن داؤد (علیہما الصلوٰۃ والسلام)

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ (آل عمران)

اور حافظ ابنِ عساکر نے ان ناموں کے علاوہ دوسرے نام بیان کیے ہیں اور ان دونوں بیانات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے تاہم اس پر تمام علماءِ انساب کا اتفاق ہے کہ عمران حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ہیں اور حنہ بنت فاقوذ بن قبیل بھی داؤد (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں[1]

عمران صاحبِ اولاد نہیں تھے اور اُن کی بیوی حنہ بہت زیادہ متمنی تھیں کہ اُن کے اولاد ہو، وہ اس کے لیے درگاہِ الٰہی میں دست بدعا اور قبولیتِ دعا کے لیے ہر وقت منتظر رہتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حنہ صحنِ مکان میں چہل قدمی کر رہی تھیں، دیکھا کہ ایک پرند اپنے بچہ کو بھرا رہا ہے، حنہ کے دل پر یہ دیکھ کر سخت چوٹ لگی اور اولاد کی تمنا نے بہت جوش مارا اور حالتِ اضطراب میں بارگاہِ الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے اور عرض کیا: "پروردگار اسی طرح مجھ کو بھی اولاد عطا کر کہ وہ ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنے۔" دل سے نکلی ہوئی دعا نے قبولیت کا جامہ پہنا اور حنہ نے چند روز بعد محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہیں۔ حنہ کو اس احساس سے اس درجہ مسرت ہوئی کہ انھوں نے نذر مان لی کہ جو بچہ پیدا ہوگا اس کو ہیکل (مسجدِ اقصیٰ) کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گی[2]

بہرحال اللہ تعالیٰ نے عمران کی بیوی حنہ کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور وہ مسرت و شادمانی کے ساتھ اُمید بر آنے کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں۔

بشر بن اسحٰق کہتے ہیں کہ حنہ ابھی حاملہ ہی تھیں کہ اُن کے شوہر عمران کا انتقال ہو گیا[3]

مریم علیہا السلام کی ولادت جب مدتِ حمل پوری ہو گئی اور ولادت کا وقت آپہنچا تو حنہ کو

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۵۹ ۔ [2] بنی اسرائیل کی مذہبی رسوم میں سے یہ رسم بہت مقدس سمجھی جاتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کریں۔ البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ۔

[3] فتح الباری، ج ۶ ص ۳۶۴ ۔

معلوم ہوا کہ اُن کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی ہے، جہاں تک اولاد کا تعلق ہے حنہ کے لیے یہ لڑکی بھی لڑکے سے کم نہ تھی مگر اُن کو یہ افسوس ضرور ہوا کہ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری نہیں ہو سکے گی، اس لیے کہ لڑکی کس طرح مقدس ہیکل کی خدمت کر سکے گی؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے افسوس کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کو ہی قبول کیا اور اس کی وجہ سے تمہارا خاندان بھی معزز اور مبارک قرار پایا، حنہ نے لڑکی کا نام مریم رکھا، سریانی میں اس کے معنی خادم[1] کے ہیں، چونکہ یہ ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کر دی گئیں اس لیے یہ نام موزوں سمجھا گیا۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کو معجزانہ اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّ	بیشک اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل
اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى	عمران[2] کو (اپنے اپنے زمانہ میں جہان والوں پر بزرگی
الْعٰلَمِيْنَ ۝ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا	عطا فرمائی (ان میں سے) بعض، بعض کی ذریت ہیں)
مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝	اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے (وہ وقت یاد کرو)
اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ	جب عمران کی بیوی نے کہا: خدایا! میں نے نذر مان لی ہے
اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ	کہ میرے پیٹ میں جو (بچہ) ہے وہ تیری راہ میں آزاد ہو،
مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ	پس تو اس کو میری جانب سے قبول فرما۔ بیشک تو
اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ فَلَمَّا	سننے والا جاننے والا ہے۔" پھر جب اس نے جنا
وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ	تو کہنے لگی: "پروردگار! میرے لڑکی پیدا ہوئی ہے
وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا	اور اللہ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا ہے اور لڑکا
وَضَعَتْ ۭ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ	اور لڑکی یکساں نہیں ہیں (یعنی ہیکل کی خدمت لڑکی
وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْٓ	نہیں کر سکتی لڑکا کر سکتا ہے) اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے

---

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۵۔ [2] عمران، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام بھی ہے اور حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا بھی۔ یہاں والدِ مریم علیہا السلام مراد ہیں۔

اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا	اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان الرجیم کے
مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝	کے فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔
فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ	پس مریم کو اس کے پروردگار نے بہت اچھی طرح
وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّكَفَّلَهَا	قبول فرمایا اور اس کی نشو ونما اچھے طریق پر کی اور
زَكَرِيَّا ۚ (سورہ آلِ عمران پ ۳ ع ۴)	زکریا کو اس کا نگران کار بنا دیا۔

حضرتِ مریم (علیہا السلام) جب سنِ شعور کو پہنچیں اور یہ سوال پیدا ہوا کہ مقدس ہیکل کی یہ امانت کس کے سپرد کی جائے تو کاہنوں[1] میں سے ہر ایک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مقدس امانت کا کفیل مجھ کو بنایا جائے مگر اس امانت کی نگرانی کا اہل حضرتِ زکریا سے زیادہ کوئی نہ تھا، اس لیے کہ وہ مریم (علیہا السلام) کی خالہ ایشاع (الیشبع) کے شوہر بھی تھے اور مقدس ہیکل کے معزز کاہن اور خدائے برتر کے نبی بھی تھے، اس لیے سب سے پہلے انھوں نے ہی اپنا نام پیش کیا مگر جب سب کاہنوں نے یہی خواہش ظاہر کی اور باہمی کشمکش کا اندیشہ ہونے لگا تو آپس میں طے پایا کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ اس کا فیصلہ کر لیا جائے۔ اور بقول روایاتِ بنی اسرائیل تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی وہ دریا میں اپنے قلم (پورے) ڈالتے مگر قرعہ کی شرط کے مطابق ہر مرتبہ زکریا (علیہ السلام) ہی کا نام نکلتا[2] کاہنوں نے جب یہ دیکھا کہ اس معاملہ میں زکریا (علیہ السلام) کے ساتھ تائیدِ غیبی ہے تو انھوں نے بخوشی اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس طرح "یہ سعید امانت" حضرتِ زکریا کے سپرد کر دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ مریم (علیہا السلام) کی کفالت کا یہ معاملہ اس لیے پیش آیا کہ وہ یتیم تھیں اور مَردوں میں سے کوئی ان کا کفیل نہیں تھا اور بعض کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں قحط کا بہت زور تھا اس لیے کفالت کا سوال پیدا ہوا۔ لیکن یہ دونوں باتیں اگر نہ بھی ہوتیں تب بھی کفالت کا سوال اپنی جگہ پھر بھی باقی رہتا اس لیے کہ مریم (علیہا السلام) اپنی والدہ کی نذر کے مطابق "نذرِ ہیکل"

---

[1] کاہن سے وہ مقدس ہستیاں مراد ہیں جو ہیکل میں مذہبی رسوم ادا کرتی اور خدمتِ ہیکل پر مامور تھیں ۱۲ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۶۰

ہو چکی تھیں اور چونکہ لڑکی تھیں اس لیے ازبس ضروری تھا کہ وہ کسی مردِ نیک کی کفالت میں اس خدمت کو انجام دیتیں

غرض زکریا (علیہ السلام) نے حضرتِ مریم (علیہا السلام) کے صنفی احترامات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہیکل کے قریب ایک حجرہ اُن کے لیے مخصوص کر دیا تاکہ وہ دن میں وہاں رہ کر عبادتِ الٰہی سے بہرہ ور ہوں اور جب رات آتی تو اُن کو اپنے مکان پر ان کی خالہ ایشاع کے پاس لے جاتے اور وہ وہیں شب بسر کرتیں[1]۔

حنہ اور ایشاع ابن کثیر فرماتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ ایشاع (الیشیع) مریم (علیہا السلام) کی ہمشیر تھیں اور حدیثِ معراج میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عیسیٰ اور یحییٰ (علیہما السلام) کے متعلق یہ فرما کر "وھما ابنا خالۃ" جو رشتہ ظاہر فرمایا ہے اس سے بھی جمہور کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

لیکن جمہور کا یہ قول قرآنِ عزیز اور تاریخ دونوں کے خلاف ہے اس لیے کہ قرآن نے مریم (علیہا السلام) کی ولادت کے واقعہ کو جس اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ عمران اور حنہ، مریم (علیہ السلام) کی ولادت سے قبل اولاد سے قطعاً محروم تھیں یہی وجہ ہے کہ حنہ نے مریم علیہا السلام کی ولادت پر یہ نہیں کہا "خدایا! میرے تو پہلے بھی ایک لڑکی

---

[1] روح المعانی سورۂ آلِ عمران ـــ مولانا آزاد ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں۔ قرآن میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ظہور کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ دو جگہ کیا گیا ہے، یہاں اور سورۂ آلِ عمران کی آیات (۳۵-۶۳) میں، یہاں یہ ذکر حضرت زکریا کی دعا اور حضرت یحییٰ کی پیدائش کے بیان سے شروع ہوا ہے اور اناجیلِ اربعہ میں سے سینٹ لوقا کی انجیل ٹھیک اسی طرح یہ تذکرہ شروع کرتی ہے لیکن سورۂ آلِ عمران میں یہ تذکرہ اس سے بھی پیشتر کے ایک واقعہ سے شروع ہوتا ہے یعنی حضرتِ مریم کی پیدائش اور ہیکل میں پرورش پانے کے واقعہ سے اور اس بارہ میں چاروں انجیلیں خاموش ہیں لیکن انیسویں صدی میں متروک اناجیل کا جو نسخہ وٹیکان کے کتب خانہ سے برآمد ہوا اس نے حضرتِ مریم کی پیدائش کا یہ مفقود ٹکڑا مہیا کر دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک سرگذشت کا یہ ٹکڑا بھی اسی طرح الہامی یقین کیا جاتا تھا جس طرح بقیہ ٹکڑے یقین کیے جاتے ہیں۔ ج ۲ ص ۴۴۳۔

موجود تھی، اب تو نے دوبارہ بھی لڑکی ہی عطا فرمائی" بلکہ درگاہِ الٰہی میں یہ عرض کیا کہ جس شکل میں میری دعا تو نے قبول فرمائی ہے اس کو حسبِ وعدہ تیری نذر کیسے کروں؟ نیز توراۃ اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ عمران اور حنہ کے مریم (علیہا السلام) کے ماسوا کوئی اور اولاد بھی تھی بلکہ اس کے برعکس تاریخِ یہود اور اسرائیلیات کا مشہور قول یہ ہے کہ الیشاع، مریم (علیہا السلام) کی خالہ تھیں۔

دراصل جمہور کی جانب یہ منسوب قول صرف حدیثِ معراج کے مسطورۂ بالا جملہ کے پیشِ نظر ظہور میں آیا ہے حالانکہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد (وھما ابنا خالۃ) وہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں مجازِ متعارف کی شکل میں ہے یعنی آپ نے بطریقِ توسع والدہ کی خالہ کو عیسیٰ کی خالہ فرمایا ہے اور اس قسم کا توسع عام بول چال میں شائع ذائع ہے۔

علاوہ ازیں ابن کثیر (رحمہ اللہ) کا اس کو قولِ جمہور کہنا بھی محلِ نظر ہے اس لیے کہ محمد بن اسحٰق، اسحٰق بن بشر، ابن عساکر، ابن جریر اور ابن حجر (رحمہم اللہ) جیسے جلیل القدر اصحابِ حدیث و سیر کا رجحان اس جانب ہے کہ الیشاع، حنہ کی ہمشیر اور مریم (علیہا السلام) کی خالہ ہیں، حنہ کی بیٹی نہیں ہیں۔

مریم علیہا السلام کا زہد و تقویٰ

مریم (علیہا السلام) شب و روز عبادتِ الٰہی میں رہتیں اور جب خدمتِ ہیکل کے لیے اُن کی نوبت آتی تو اس کو بھی بخوبی انجام دیتی تھیں حتیٰ کہ ان کا زہد و تقویٰ بنی اسرائیل میں ضرب المثل بن گیا اور ان کی زہادت و عبادت کی مثالیں دی جانے لگیں۔

مقبولیتِ خداوندی

زکریا (علیہ السلام) مریم (علیہا السلام) کی ضروری نگہداشت کے سلسلہ میں کبھی کبھی ان کے حجرہ میں تشریف لیجایا کرتے تھے لیکن ان کو یہ بات عجیب نظر آتی کہ جب وہ خلوتکدہ میں داخل ہوتے تو مریم (علیہا السلام) کے پاس اکثر بے موسم کے تازہ پھل موجود پاتے[1] — آخر

---

[1] یہ تفصیل اگرچہ تفسیری روایات سے ماخوذ ہے اور آیت میں صرف لفظ "رزق" آیا ہے لیکن آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ مریم کا یہ رزق انسانی داد و دہش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ بطور کرامت من جانب اللہ تھا۔ (مؤلف)

زکریا (علیہ السلام) سے نہ رہا گیا اور انھوں نے دریافت کیا: مریم تیرے پاس یہ بے موسم پھل کہاں سے آتے ہیں؟ مریم (علیہا السلام) نے فرمایا: "یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے، وہ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق پہنچاتا ہے۔" حضرتِ زکریاؑ نے یہ سُنا تو سمجھ گئے کہ خدائے برتر کے یہاں مریمؑ کا خاص مقام اور مرتبہ ہے اور ساتھ ہی بے موسم تازہ پھلوں کے واقعہ نے دل میں یہ تمنا پیدا کر دی کہ جس خدا نے اپنی قدرتِ کاملہ سے یہ پھل بے موسم پیدا کر دیے، کیا وہ میرے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود مجھ کو بے موسم پھل (بیٹا) عطا نہ کرے گا؟ یہ سوچ کر انھوں نے خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہِ ربانی میں دعا کی اور وہاں سے شرفِ قبولیت کا مژدہ عطا ہوا:۔

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا	اور اُس (مریم) کی کفالت زکریا نے کی، جب اُس
زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا	(مریم) کے پاس زکریا داخل ہوتے تو اس کے پاس
رِزْقًا ۖ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ	کھانے کی چیزیں رکھی پاتے۔ زکریا نے کہا: "اے
هٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۖ	مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آئیں"۔ مریم نے کہا "یہ
اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ	اللہ کے پاس سے آتی ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس کو
حِسَابٍ ۝ (سورہ آل عمران پ ۳)	چاہتا ہے بے گمان رزق دیتا ہے۔"

مریم (علیہا السلام) اسی طرح ایک عرصہ تک اپنے مقدس مشاغل کے ساتھ پاک زندگی بسر کرتی رہیں اور مقدس ہیکل کا سب سے مقدس مجاور حضرتِ زکریا (علیہ السلام) بھی ان کے زہد و تقویٰ سے بیحد متاثر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عظمت اور جلالتِ قدر کو اور زیادہ بلند کیا اور فرشتوں کے ذریعہ اُن کو برگزیدۂ بارگاہِ الٰہی ہونے کی یہ بشارت سُنائی:۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ	(اے پیغمبر وہ وقت یاد کیجیے) جب فرشتوں نے
اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ	کہا: اے مریم! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو
وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ	بزرگی دی اور پاک کیا اور دُنیا کی عورتوں پر تجھ کو

الْعٰلَمِيْنَ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ	برگزیدہ کیا، اے مریم! اپنے پروردگار کے سامنے جھک جا اور سجدہ ریز
وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝	ہو جا اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز ادا کر"
..... وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ	اور تم اس وقت ان کاہنوں کے پاس موجود نہ تھے
اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ	جب وہ اپنے قلموں (پوروں) کو قرعہ اندازی کے لیے
اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ	ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے اور تم اس وقت
وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ	(بھی) موجود نہ تھے جب وہ اس کفالت کے بارے میں
اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ (سورہ آل عمران پ ۳ ع ۶)	آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

حضرتِ مریم (علیہا السلام) جبکہ نہایت مُرتاض، عابد و زاہد اور تقویٰ و طہارت میں ضرب المثل تھیں اور جبکہ عنقریب ان کو جلیل القدر پیغمبر حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کی والدۂ ماجدہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہونے والا تھا تو من جانب اللہ ان کی تقدیس و تطہیر کا یہ اعلان بلاشبہ حق بجقدار رسید کا مصداق ہے، تاہم علمی اور تاریخی اعتبار سے بلکہ خود قرآن و احادیث کے مفہوم کے لحاظ سے یہ مسئلہ قابلِ توجہ ہے کہ آیت "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کی مُراد کیا ہے، اور کیا درحقیقت حضرتِ مریم علیہا السلام کو بغیر کسی استثناء کے کائنات کی تمام عورتوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہے؟ اور یہی نہیں بلکہ اس آیتِ فضیلت نے مریمؑ کی ذات سے متعلق علماء سلف میں چند اہم مسائل کو زیرِ بحث بنا دیا ہے مثلاً (۱) کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ (۲) کیا حضرتِ مریمؑ نبی تھیں؟ (۳) اگر نبی نہیں تھیں تو آیت کے جملہ "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کا مطلب کیا ہے؟

کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ محمد بن اسحٰق، شیخ ابوالحسن اشعری، قرطبی، ابن حزم (نور اللہ مرقدہم) اِس جانب مائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے بلکہ ابن حزم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرتِ حوا، سارہ، ہاجرہ، ام موسیٰؑ، آسیہ اور مریم (علیہن السلام) یہ سب نبی تھیں، اور محمد بن اسحٰق رح کہتے ہیں کہ اکثر فقہاء اس کے قائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے اور قرطبی فرماتے ہیں کہ

مریم (علیہا السلام) نبی تھیں۔

ان حضرات کے اقوال کے برعکس خواجہ حسن بصری، امام الحرمین شیخ عبدالعزیز اور قاضی عیاض (نور اللہ مرقدہم) کا رجحان اس جانب ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی اور اس لیے مریم علیہا السلام بھی نبی نہیں تھیں۔ قاضی اور ابن کثیر یہ بھی کہتے ہیں کہ جمہور کا مسلک یہی ہے اور امام الحرمین تو اجماع تک کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی وہ اپنی دلیل میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں:-

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا	اور تم سے پہلے ہم نے نہیں بھیجے مگر مرد کہ وحی
رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ (النحل)	بھیجتے تھے ہم اُن کی طرف۔

اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریمؑ کی نبوت کے انکار پر یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن عزیز نے اُن کو "صدیقہ" کہا ہے، سورۂ مائدہ میں ہے:-

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ	بس ابن مریم تو ایک پیغمبر ہیں جن سے
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ	پہلے اور بھی پیغمبر گذر چکے اور اُن کی
وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ (مائدہ)	والدہ صدیقہ تھیں۔

اور سورۂ نساء میں قرآن عزیز نے منعم علیہم کی جو فہرست دی ہے وہ اس کے لیے نص قطعی ہے کہ صدیقیت کا درجہ نبوت سے کم اور نازل ہے۔[1]

اور جو حضرات عورت کے نبی ہونے کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآن عزیز نے حضرت سارہ، اُم موسیٰؑ اور حضرت مریم (علیہن السلام) کے متعلق جن واقعات کا اظہار کیا ہے ان میں بصراحت موجود ہے کہ ان پر خدا کے فرشتے وحی لے کر نازل ہوئے اور ان کو منجانب اللہ بشارات سے سرفراز فرمایا اور ان تک اپنی معرفت، عبادت کا حکم پہنچایا، چنانچہ

---

[1] اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔

حضرت سارہ کے لیے سورۂ ہود اور سورۂ الذّٰریٰت اور ام موسیٰ کے لیے سورۂ قصص میں اور مریم علیہا السلام کے لیے آلِ عمران اور سورۂ مریم میں بواسطۂ ملائکہ اور بلاواسطہ خطابِ الٰہی موجود ہے اور ظاہر ہے کہ ان مقامات پر وحی کے لغوی معنی (وجدانی ہدایت یا مخفی اشارہ) کے نہیں ہیں، جیسا کہ آیت "وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ" میں شہد کی مکھی کے لیے وحی کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اور خصوصیت کے ساتھ حضرتِ مریم (علیہا السلام) کے نبی ہونے کی یہ واضح دلیل ہے کہ سورۂ مریم میں اُن کا ذکر اُسی اسلوب کے ساتھ کیا گیا ہے جس طریقہ پر دیگر انبیاء و رسل کا تذکرہ کیا ہے مثلاً "وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ مُوْسٰی" "وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِدْرِیْسَ" "وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ" "وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِبْرٰهِیْمَ" "وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ مَرْیَمَ" یا مثلاً "وَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهَا رُوْحَنَا" ہم نے مریم کی جانب اپنے فرشتہ جبرئیل کو بھیجا۔ یا مثلاً "قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ" میں بلاشبہ تیرے پروردگار کی جانب سے پیغامبر ہوں۔ نیز آلِ عمران میں مریم علیہا السلام کو ملائکہ اللہ نے جس طرح خدا کی جانب سے پیغامبر بن کر خطاب کیا ہے وہ بھی اس دعویٰ کی روشن دلیل ہے۔

اور مریم (علیہا السلام) کے صدیقہ ہونے سے متعلق جو سوال ہے اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر قرآن نے حضرتِ مریم (علیہا السلام) کو صدیقہ کہا ہے تو یہ لقب اُن کی شانِ نبوت کے اسی طرح منافی نہیں ہے جس طرح حضرتِ یوسف (علیہ السلام) کے مُسلّم نبی ہونے کے باوجود آیت "یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ" میں اُن کا صدیق ہونا ان کے نبی ہونے کو مانع نہیں ہے بلکہ ذکرِ پاک مقامی خصوصیت کی بنا پر مذکور ہوا ہے۔ کیونکہ جو "نبی" ہے وہ بہرحال "صدیق" ضرور ہے البتہ اس کا عکس ضروری نہیں ہے۔

ان علماءِ اسلام کی ترجمانی جس تفصیل کے ساتھ کتاب الفصل میں مشہور محدث ابن حزم (رحمہ اللہ) نے کی ہے اس تفصیل و قوت کے ساتھ دوسری جگہ نظر سے نہیں گذری اس لیے

---

[1] سورۂ ہود آیت ۷۱-۷۲، والذّٰریٰت آیۃ ۲۸-۲۹۔ [2] سورۂ قصص آیۃ ۷ [3] آلِ عمران آیۃ ۴۲-۴۳ و ۴۵-۴۷۔ و سورۂ مریم آیۃ ۲۶ تا ۱۹۔ [4] سورۂ یوسف۔

سطورِ ذیل میں اس پورے مضمون کا ترجمہ لائقِ مطالعہ ہے:۔

نبوۃ النساء اور ابن حزم | یہ فصل ایسے مسئلہ کے متعلق ہے جس پر ہمارے زمانہ میں قرطبہ (اندلس) میں شدید اختلاف بپا ہوا، علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی اور جو ایسا کہتا ہے کہ عورت نبی ہو سکتی ہے وہ ایک نئی بدعت ایجاد کرتا ہے اور دوسری جماعت قائل ہے کہ عورت نبی ہو سکتی ہے اور نبی ہوئی ہیں' اور ان دونوں سے الگ تیسری جماعت کا مسلک توقف ہے اور وہ اثبات و نفی دونوں باتوں میں سکوت کو پسند کرتے ہیں مگر جو حضرات عورت سے متعلق منصبِ نبوت کا انکار کرتے ہیں اُن کے پاس اس انکار کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی البتہ بعض حضرات نے اپنے اختلاف کی بنیاد اس آیت کو بنایا ہے۔ "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ"

میں کہتا ہوں کہ اس بارہ میں کس کو اختلاف ہے اور کس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عورت کو ہدایتِ خلق کے لیے رسول بنا کر بھیجتا ہے یا اس نے کسی عورت کو "رسول" بنایا ہے' بحث رسالت کے مسئلہ میں نہیں ہے بلکہ نبوت میں ہے، پس طلبِ حق کے لیے ضروری ہے کہ اوّل یہ غور کیا جائے کہ لغتِ عرب میں لفظِ "نبوت" کے کیا معنی ہیں؟ تو ہم اس لفظ کو "انباء" سے ماخوذ پاتے ہیں جس کے معنی "اطلاع دینا" ہیں، پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کسی معاملہ کے ہونے سے قبل بذریعہ وحی اطلاع دے یا کسی بھی بات کے لیے اس کی جانب وحی نازل فرمائے وہ شخص مذہبی اصطلاح میں بلاشبہ "نبی" ہے۔

آپ اس مقام پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وحی کے معنی اس الہام کے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کی سرشت میں ودیعت کر دیا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کے متعلق خدائے برحق کا ارشاد ہے "وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ" اور نہ وحی کے معنی ظن اور وہم کے لے سکتے ہیں اس لیے کہ ان دونوں کو "علمِ یقین" سمجھنا (جو وحی کا قدرتی نتیجہ ہے) ہمنوں کے سوا اور کسی کا کام نہیں ہے اور نہ یہاں وہ معنی مراد ہو سکتے ہیں جو "باب کہانۃ" سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی

یہ کہ شیاطین آسمانی باتوں کو سننے اور چرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُن پر شہاب ثاقب کے ذریعہ رجم کیا جاتا ہے اور جس کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے: "شَيَاطِيْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا" کیونکر یہ باب کہا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے وقت سے مسدود ہو گیا۔ اور نہ اس جگہ وحی کے معنی نجوم کے تجربات علمیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو خود انسانوں کے باہم سیکھنے اور سکھانے سے حاصل ہو جایا کرتے ہیں اور نہ اس کے معنی اُس کے رویا (خواب) کے ہو سکتے ہیں جن کے سچ یا جھوٹ ہونے کا کوئی علم نہیں ہے بلکہ ان تمام معانی سے جُدا "وحی بمعنی نبوۃ" یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے قصد اور ارادہ سے ایک شخص کو ایسے امور کی اطلاع دے جن کو وہ پہلے سے نہیں جانتا اور مسطورۂ بالا ذرائع علم سے الگ یہ امور حقیقت ثابتہ بن کر اُس شخص پر اس طرح منکشف ہو جائیں گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اس علم خاص کے ذریعہ اس شخص کو بغیر کسی محنت و کسب کے بداہتہً ایسا صحیح یقین عطا کر دے کہ وہ ان امور کو اس طرح معلوم کر لے جس طرح وہ حواس اور بداہت عقل کے ذریعہ حاصل کر لیا کرتا ہے اور اس کو کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور خدا کی یہ وحی یا تو اس طرح ہوتی ہے کہ فرشتہ آکر اس شخص کو خدا کا پیغام سناتا ہے اور یا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ براہ راست اس سے خطاب کرتا ہے۔

پس اگر ان حضرات کے نزدیک جو عورت کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں نبوۃ کے معنی یہ نہیں ہیں تو وہ ہم کو سمجھائیں کہ آخر نبوت کے معنی ہیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے ماسوا اور کوئی معنی بیان ہی نہیں کر سکتے۔

اور جبکہ نبوت کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے تو اب قرآن کے ان مقامات کو بغور مطالعہ کیجئے جہاں یہ مذکور ہے کہ اللہ عزوجل نے عورتوں کے پاس فرشتوں کو بھیجا اور فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان عورتوں کو "وحی حق" سے مطلع کیا چنانچہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُمّ اسحٰق (سارہ علیہا السلام) کو اسحٰق (علیہ السلام) کی ولادت کی بشارت

سُنائی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ" ان آیات میں فرشتوں نے ام اسحٰق کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسحٰق اور اُن کے بعد یعقوب (علیہما السلام) کی بشارت سُنائی ہے اور سارہؓ کے تعجب پر یہ کہہ کر دوبارہ خطاب کیا ہے "اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ" تو یہ کیسے ممکن ہے کہ والدۂ اسحٰق (سارہ) علیہا السلام نبی نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ اس طرح اُن سے خطاب کرے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جبرئیل فرشتہ کو مریم (اُم عیسیٰ علیہا السلام) کے پاس بھیجتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے یہ کہتا ہے "وَقَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا" تو یہ "وحی حقیقی" کے ذریعہ نبوت نہیں تو اور کیا ہے اور کیا اس آیت میں صاف طور پر نہیں کہا گیا ہے کہ مریم (علیہا السلام) کے پاس جبرئیل (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغامبر بن کر آئے؟ نیز زکریا (علیہ السلام) جب مریم (علیہا السلام) کے حجرہ میں آتے تو اُن کے پاس اللہ کا غیب سے دیا ہوا رزق پاتے تھے اور انھوں نے اسی رزق کو دیکھ کر بارگاہِ الٰہی میں صاحبِ فضیلت لڑکا پیدا ہونے کی دعا کی تھی، اسی طرح ہم موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کے معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر وحی نازل فرمائی کہ تم اپنے اس بچہ کو دریا میں ڈال دو اور ساتھ ہی ان کو اطلاع دی کہ میں اس کو تمہاری جانب واپس کروں گا اور اس کو "نبی مرسل" بناؤں گا، پس کون شک کر سکتا ہے کہ یہ "نبوت" کا معاملہ نہیں ہے، معمولی عقل و شعور رکھنے والا آدمی بھی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ شرفِ نبوت سے وابستہ نہ ہوتا اور محض خواب کی بنا پر یا دل میں پیدا شدہ وسوسہ کی وجہ سے وہ ایسا کرتیں تو ان کا یہ عمل نہایت ہی مجنونانہ اور متہورانہ ہوتا اور اگر آج ہم میں سے کوئی ایسا کر بیٹھے تو ہمارا یہ عمل یا گناہ قرار پائے گا اور یا ہم کو مجنوں اور پاگل کہا جائے گا

اور علاج کے لیے پاگل خانہ بھیج دیا جائے گا، یہ ایک ایسی صاف اور واضح بات ہے جس میں شک وشبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب یہ کہنا قطعاً درست ہے کہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا موسیٰؑ کو دریا میں ڈالنا اسی طرح وحیِ الٰہی کی بنا پر تھا جس طرح حضرتِ ابراہیمؑ نے رؤیا[1] (خواب) میں اپنے بیٹے (اسمٰعیل علیہ السلام) کا ذبح کرنا بذریعہ وحی معلوم کر لیا تھا اس لیے کہ اگر حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) نبی نہ ہوتے اور ان کے ساتھ وحی الٰہی کا سلسلہ وابستہ نہ ہوتا اور پھر وہ یہ عمل محض ایک خواب یا نفس میں پیدا شدہ ظن کی وجہ سے کر گذرتے تو ہر شخص ان کے اس عمل کو یا گناہ سمجھتا یا انتہائی جنون یقین کرتا تو اب بغیر کسی تردد کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ام موسیٰ (علیہا السلام) نبی تھیں۔

علاوہ ازیں حضرتِ مریم (علیہا السلام) کی نبوت پر ایک یہ دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ کٓهٰیٰعٓصٓ میں اُن کا ذکر انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں کیا ہے اور اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ" (یہی ہیں وہ انبیاء آدم کی نسل سے اور ان میں سے جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کیا جن پر اللہ کا انعام واکرام ہوا) تو آیت کے اس عموم میں مریم (علیہا السلام) کی تخصیص کر کے ان کو انبیاء کی فہرست میں سے الگ کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

رہی یہ بات کہ قرآن نے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر کرتے ہوئے حضرتِ مریم (علیہا السلام) کے لیے یہ کہا ہے "وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ" تو یہ لقب اُن کی نبوت کے لیے اسی طرح مانع نہیں جس طرح حضرتِ یوسف (علیہ السلام) کے نبی اور رسول ہونے کے لیے یہ آیت مانع نہیں: "يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ" اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ (وباللہ التوفیق)

اب حضرتِ سارہ، حضرتِ مریم، حضرتِ ام موسیٰ (علیہن السلام) کے مسئلۂ نبوت

---

[1] نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک حدیث میں ایسا ہی فرمایا ہے۔

کے ساتھ فرعون کی بیوی (آسیہ) کو بھی شامل کر لیجئے اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا مریم بنت عمران وآسیة بنت مزاحم امراءة فرعون (او کما[1] قال علیہ السلام) یعنی مردوں میں سے تو بہت سے آدمی کامل ہوئے ہیں مگر عورتوں میں سے صرف یہی دو کامل ہوئیں مریم بنت عمران اور آسیہ بنت مزاحم زوجۂ فرعون۔

اور واضح رہے کہ مردوں میں یہ درجۂ کمال بعض رسولوں (علیہم السلام) ہی کو حاصل ہوا ہے اور اگرچہ ان کے علاوہ انبیاء و رسل بھی درجۂ نبوت و رسالت پر مامور ہیں لیکن ان مرسلین کاملین کے درجہ سے نازل ہیں، اس لیے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عورتوں کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا ہے ان میں صرف ان دو عورتوں کو ہی درجۂ کمال تک پہنچنے کی فضیلت حاصل ہے کیونکہ حدیث میں جس درجۂ کمال کا ذکر ہو رہا ہے جو عورتیں بھی اس درجہ سے نازل ہے وہ کامل نہیں ہے۔

بہرحال اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگرچہ بعض عورتیں بہ نص قرآن نبی ہیں لیکن ان میں سے ان دو عورتوں کو بھی درجۂ کمال حاصل ہوا۔ درجات کے اس فرق کو خود قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے: "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ" حقیقت یہ ہے کہ کامل اس کو کہا جاتا ہے جس کی نوع میں سے کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہ ہو، پس مردوں میں سے ایسے کامل خدا کے چند ہی رسول ہوئے ہیں جن کی ہمسری دوسرے انبیاء و رسل کو عطا نہیں ہوئی اور بلاشبہ ان ہی کاملین میں سے ہمارے پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہیں جن کے متعلق نصوص (قرآن و حدیث) نے ان فضائل کمال کا اظہار کیا ہے جو دوسرے انبیاء و رسل کو حاصل نہیں ہیں، اسی طرح عورتوں میں سے وہی درجۂ کمال کو

---

[1] بخاری میں الفاظ حدیث یہ ہیں: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا امراۃ فرعون ومریم بنت عمران وان فضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام۔

پہنچی ہیں جن کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کیا ہے۔[1]

ابن حزم (رحمہ اللہ) کے اس طویل مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر وحی کے اُن معانی کو نظر انداز کر کے جن کا اطلاق بلحاظِ عموم لغتِ جبلّت یا نفس میں ظن و وہم کے درجہ کا القاء والہام پر ہوتا ہے "وہ اصطلاحی معنی لیے ہیں جن کو قرآن نے انبیاء و رُسُل کے لیے مخصوص کیا ہے تو اسکی دو صورتیں ہیں ایک وہ (وحی) جس کا منشاء مخلوقِ خدا کی رشد و ہدایت اور تعلیم اوامر و نواہی ہے ہو۔ اور دوسری یہ کہ خدائے تعالیٰ کسی شخص سے براہِ راست یا فرشتہ کے واسطہ سے اس قسم کا خطاب کرے کہ جس سے بشارات دینا، کسی ہونے والے واقعہ کی ہونے سے قبل اطلاع دینا، یا خاص اس کی ذات کے لیے کوئی امر و نہی فرمانا مقصود ہو' اب اگر پہلی صورت ہے تو یہ "نبوۃ مع الرسالۃ" ہے اور بالاتفاق سب کے نزدیک یہ درجہ صرف مَردوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے جیسا کہ سورۂ النحل کی آیت سے واضح ہے اور اس مسئلہ میں قطعاً دو رائے نہیں ہیں۔

اور اگر وحیِ الٰہی کی دوسری شکل ہے تو ابن حزمؒ اور اُن کے مؤیدین علماء کی رائے میں یہ بھی نبوت ہی کی ایک قسم ہے کیونکہ قرآنِ عزیز نے سورۂ شوریٰ میں انبیاء علیہم السلام پر نزولِ وحی کے جو طریقے بیان کیے ہیں وہ اس وحی پر بھی صادق آتے ہیں۔ سورۂ شوریٰ میں ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	اور کسی انسان کے لیے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے
اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ	(بالمشافہ) گفتگو کرے مگر یا وحی کے ذریعہ یا پسِ پردہ کلام کے ذریعہ
اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ	اور یا اس صورت سے کہ اللہ کسی فرشتہ کو پیغامبر بنا کر بھیجے اور وہ
مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝	اس کی اجازت سے جس کو کہ وہ چاہے اس بشر کو وحی لا کر سنا دے
(سورۂ شوریٰ پ ۲۵ ع ۱)	بلاشبہ وہ بلند و بالا حکمت والا ہے۔

---

[1] الفصل فی الملل والاہواء والنحل مطبوعہ مصر ۱۳۴۸ھ ج ۵ ص ۱۴-۱۳-۱۲ - یہ بحث فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۸، ۳۴۷ و ۳۶۸ مطبوعہ مصر میں بھی قابلِ مراجعت ہے۔

[2] یہاں نبی اور رسولوں کے اس فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو علمِ کلام کی خاص اصطلاح ہے کیونکہ قرآن کثرت کے ساتھ نبی اور رسول کو مرادف معنی میں استعمال کرتا ہے۔

اور جبکہ قرآن نے وحی کی اس دوسری قسم کا اطلاق بہ نصِ صریح حضرتِ مریم، حضرتِ سارہ، حضرتِ اُمِ موسیٰ اور حضرتِ آسیہ (علیہن السلام) پر کیا ہے جیسا کہ سورۂ ہود، قصص اور مریم سے ظاہر ہوتا ہے تو ان مقدس عورتوں پر "نبی" کا اطلاق "قطعاً" صحیح ہے اور اس کو بدعت کہنا سرتاسر غلط ہے۔

ابنِ حزم (رحمہ اللہ) کے مؤید علماء نے اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے اس شبہ کا جواب بھی دیا ہے کہ قرآن نے جس طرح صاف الفاظ میں مرد انبیاء کو نبی اور رسول کہا ہے اس طرح ان عورتوں میں سے کسی کو نہیں کہا" جواب کا حاصل یہ ہے کہ جبکہ "نبوۃ مع الرسالۃ" جو کہ مَردوں کے لیے ہی مخصوص ہے کائناتِ انسانی کی رشد و ہدایت اور تعلیم و تبلیغ نوعِ انسانی سے متعلق ہوتی ہے تو اس کا قدرتی تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو اس شرف سے ممتاز فرمایا ہے اس کے متعلق وہ صاف صاف اعلان کرے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا نبی اور رسول ہے، تاکہ اُمت پر اس کی دعوت و تبلیغ کا قبول کرنا لازم ہو جائے اور خدا کی حجت پوری ہو، اور چونکہ نبوت کی وہ قسم جس کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے خاص اس ہستی سے وابستہ ہوتی ہے جس کو یہ شرف ملا ہے تو اس کے متعلق صرف یہی اظہار کر دینا کافی ہے کہ جو "وحی من اللہ" انبیاء و رسل کے لیے ہی مخصوص ہے اُس سے ان چند عورتوں کو بھی مشرف کیا گیا ہے۔

عورتوں کی نبوت کے اثبات و انکار کے علاوہ تیسری رائے ان علماء کی ہے جو اِس مسئلہ میں "سکوت اور توقف" کو ترجیح دیتے ہیں ان میں شیخ تقی الدین سبکی (رحمہ اللہ) نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، فتح الباری میں اُن کا یہ قول مذکور ہے:-

قال السبکی اختلف فی هذه المسئلة ولم یصح عندی فی ذلك شیٔ الخ [1]	سبکی فرماتے ہیں" اس مسئلہ میں علماء کی آراء مختلف ہیں اور میرے نزدیک اس بارہ میں اِثباتاً یا نفیاً کوئی بات ثابت نہیں ہے۔

[1] فتح الباری ج ۔۔ کتاب الانبیاء۔

کیا حضرتِ مریمؑ نبی ہیں

اِس تفصیل سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی نبوت کے انکار پر امام الحرمین کا دعوائے اجماع صحیح نہیں ہے نیز یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فہرستِ انبیا میں مسطورۂ بالا دوسری مقدس عورتوں کے مقابلہ میں حضرتِ مریمؑ کی نبوت کے متعلق قرآنی نصوص زیادہ واضح ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام شعرانی، ابن حزم اور قرطبی (رحمہم اللہ) کے درمیان حضرتِ مریمؑ کے علاوہ نبیات کی فہرست کے بارہ میں خاصہ اختلاف نظر آتا ہے[1] اور حضرتِ مریمؑ کی نبوت کے متعلق تمام مثبتینِ نبوت کا اتفاق ہے۔

ہم کو ابن کثیر (رحمہ اللہ) کے اس دعویٰ سے بھی اختلاف ہے کہ جمہور انکار کی جانب ہیں، البتہ اکثریت غالباً سکوت اور توقف کو پسند کرتی ہے۔

آیت "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کا مطلب

جو علماء عورتوں میں نبوت کے قائل ہیں اور حضرتِ مریم (علیہا السلام) کو نبی تسلیم کرتے ہیں، ان کے مسلک کے مطابق تو آیت "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کا مطلب صاف اور واضح ہے وہ یہ کہ حضرتِ مریمؑ کو کائنات کی تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، جو عورتیں نبی نہیں ہیں اُن پر اس لیے کہ مریم (علیہا السلام) نبی ہیں اور جو عورتیں نبی ہیں اُن پر اس لیے کہ وہ اُن قرآنی نصوص کے پیشِ نظر جو اُن کے فضائل و کمالات سے تعلق رکھتی ہیں باقی نبیات پر برتری رکھتی ہیں۔

لیکن جو علماء عورتوں کی نبوت کا انکار فرماتے ہیں اور حضرتِ مریمؑ کو "نبیہ" نہیں تسلیم کرتے وہ اس آیت کی مراد میں دو جُدا جُدا خیال رکھتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آیت کا جُملہ "نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" عام ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کی تمام عورتوں کو شامل ہے۔ اس لیے بلاشبہ حضرتِ مریمؑ کو بغیر کسی استثناء کے کائناتِ انسانی کی تمام عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ آیت کے لفظ "العٰلمین" سے کائنات کی وہ تمام عورتیں مراد ہیں جو حضرتِ مریم (علیہا السلام) کی معاصر تھیں۔ یعنی قرآن عزیز حضرتِ مریم (علیہا السلام) کے زمانہ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بشارت دی کہ وہ اپنے زمانہ کی تمام

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۔۔۔

عورتوں میں برگزیدہ اور صاحبِ کمال ہیں اور ہم نے ان سب میں سے اُن کو چُن لیا ہے اور "العٰلمین" کا یہ اطلاق وہی حیثیت رکھتا ہے جو حضرتِ موسیٰؑ کی اُمت (بنی اسرائیل) کے لیے اس آیت میں اختیار کی گئی ہے:-

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (دخان پ ۲۵ ع ۲) اور بلاشبہ ہم نے اپنے علم سے اُن (بنی اسرائیل) کو جہان والوں کے مقابلہ میں پسند کر لیا ہے۔

اور جبکہ باتفاقِ آراء بنی اسرائیل کی فضیلت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ "العٰلمین" سے اُن کی معاصر اُمم و اقوام مراد ہیں کہ اُن میں سے اُمتِ موسیٰ علیہ السّلام کو فضیلت حاصل ہے تو حضرتِ مریم (علیہا السلام) کی فضیلت کے باب میں بھی یہی معنی مراد لینے چاہئیں۔

حضرتِ مریمؑ کا تقدس اور تقویٰ و طہارت حضرتِ عیسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر کی والدہ ہونے کا شرف، مرد کے ہاتھ لگائے بغیر معجزہ کے طور پر اُن کے مشکوئے معلّٰی سے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادتِ باسعادت بلاشبہ ایسے امور ہیں جن کی بدولت اُن کو معاصر عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل تھی۔

پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ بابِ فضیلت ایک وسیع باب ہے اور جس طرح کسی شے کی حقیقت بیان کرنے میں بلیغ اور عمدہ طریقِ بیان یہ ہے کہ وہ جامع و مانع ہو یعنی اس کی حقیقت پر اس طرح حاوی ہو کہ تمام دوسری چیزوں سے ممتاز ہو جائے، نہ ایسی کمی رہ جائے کہ اصل حقیقت پوری طرح بیان نہ ہو سکے اور نہ ایسا اضافہ ہو کہ بعض دوسری حقائق بھی اس کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اسی طرح اس کے برعکس بیانِ فضیلت کے لئے فصاحت و بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو بیانِ حقیقت کی طرح حدود و قیود میں نہ جکڑ دیا جائے کیونکہ اس مقام پر حقیقتِ شے نہیں بلکہ فضیلتِ شے کا اظہار ہو رہا ہے جو اگر اسی طرح کے دوسرے افراد پر بھی صادق آجائے تو بیانِ حقیقت کی طرح اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا بلکہ اس موقع پر وسعتِ بیان ہی ازبس ضروری ہوتا ہے تاکہ مخاطب کے دل میں اظہارِ فضیلت

سے جو نفسیاتی اثر پیدا کرنا ہے وہ دل نشین اور مؤثر ہو سکے۔

تو ایسی صورت میں "عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ" کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ حضرتِ مریم علیہا السلام کے علاوہ دوسری کوئی مقدس عورت اس شرف کو نہیں پہنچ سکتی یا نہیں پہنچی بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ حضرتِ مریمؑ کو فضائل و کمالات میں بلند سے بلند مرتبہ حاصل ہے، بابِ فضائل کی یہی وہ حقیقت ہے جس کے فراموش کر دینے پر فضائلِ صحابہ وغیرہ میں اکثر ہم کو لغزش ہو جاتی اور چند مقدس اشخاص سے متعلق فضائل کے مابین تضاد و تناقض نظر آنے لگتا ہے، البتہ ان فضائل کی حدود سے گذر کر جب ہم صاحبِ فضائل افراد کے انفرادی و اجتماعی اعمال کا جائزہ لے کر فرقِ مراتب بیان کرتے ہیں تو وہ ضرور ایک دوسرے کے لئے حدِ فاصل ثابت ہوتے ہیں مثلاً حضراتِ صحابہ و صحابیات کے فضائل کے پیشِ نظر فرقِ مراتب کا صحیح فیصلہ جب ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ اُن کے اُن فضائل کے ساتھ ساتھ جو زبانِ وحی ترجمان سے نکلے ہیں ان سے متعلق خصوصی ارشاداتِ قرآنی و حدیثی، اُن کی اسلامی خدمات، اسلام سے متعلق ان کی سرفروشیاں و جاں سپاریاں، نصرتِ حق میں مالی فداکاریاں، اسلام کے نازک ترین لمحات میں ان کے علم و تدبر کی عقدہ کشائیاں اور ان کی عملی جد و جہد کی رفیع سرگرمیاں ان سب کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے۔

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) اور بشاراتِ کتبِ سابقہ

ادیان و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دینِ حق اور ملتِ بیضاء کی تبلیغ و دعوت کا سلسلہ اگرچہ آدم (علیہ السلام) سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک برابر جاری رہا ہے لیکن اس سلسلہ کو مزید قوت پہنچانے اور سربلند کرنے کے لئے سنۃ اللہ یہ رہی ہے کہ صدیوں بعد ایک ایسے اولوالعزم اور جلیل القدر پیغمبر کو بھیجے جو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے پیدا شدہ عام روحانی اضمحلال کو دور کر کے قبولِ حق کے افسردہ رجحانات میں تازگی بخشے اور ضعیف روحانی عواطف کو قوی سے قوی تر بنا دے گویا مذہب کی خوابیدہ دنیا میں حق و صداقت کا صور پھونک کر ایک انقلابِ عظیم

بپا کردے اور مُردہ دلوں میں نئی روح ڈال دے اور اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ جن اقوام و امم میں اُس عظیم المرتبہ پیغمبر کی بعثت ہونے والی ہوتی ہے صدیوں پہلے ان کے ہادیانِ ملت اور داعیانِ حق (انبیاء علیہم السلام) اس مقدس رسول کی آمد کی بشارات وحیِ الٰہی کے ذریعہ سناتے رہتے ہیں تاکہ اس کی دعوتِ حق کے لئے زمین ہموار رہے اور جب اس نورِ حق کے روشن ہونے کا وقت آجائے تو اِن اقوام و امم کے لیے اُس کی آمد غیر متوقع حادثہ نہ بن جائے۔

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) بھی اُن چند اولوالعزم، جلیل القدر اور مقدس رسولوں میں سے ایک ہیں اور اسی بناء پر انبیاء بنی اسرائیل میں سے متعدد انبیاء علیہم السلام اُن کی آمد سے قبل ان کے حق میں منادی کرتے اور آمد کی بشارت سُناتے نظر آتے ہیں اور ان ہی بشارات کی وجہ سے بنی اسرائیل مدتِ مدید سے منتظر تھے کہ مسیح موعود کا ظہور ہو تو ایک مرتبہ وہ پھر حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ کی طرح اقوامِ عالم میں معزز و ممتاز ہوں گے۔ اور رشد و ہدایت کی خشک کھیتی میں روحِ تازہ پیدا ہوگی۔ اور خدا کے جاہ و جلال سے اُن کے قلوب ایک مرتبہ پھر چمک اُٹھیں گے۔ بائیبل (توراۃ و انجیل) اپنی لفظی و معنوی تحریفات کے باوجود آج بھی اُن چند بشارات کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتی ہے جو حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی آمد سے تعلق رکھتی ہیں۔ توراۃ استثناء میں ہے:-

اور اس موسیٰ نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر (ساعیر) سے اُن پر طلوع ہوا، اور فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا۔ (باب ۳۳۔ آیت ۲۰)

اِس بشارت میں "سینا سے خدا کی آمد" حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کی نبوت کی جانب اشارہ ہے اور "ساعیر سے طلوع ہونا" نبوتِ عیسیٰ (علیہ السلام) مُراد ہے، کیونکہ انکی ولادتِ باسعادت اسی پہاڑ کے ایک مقام "بیت اللحم" میں ہوئی ہے اور یہی وہ مُبارک جگہ ہے جہاں سے نورِ حق طلوع ہوا اور "فاران پر جلوہ گر ہونا" آفتابِ رسالت کی بعثت کا اعلان ہے کیونکہ فاران، حجاز کے مشہور پہاڑی سلسلہ کا نام ہے۔[1]

[1] تفصیل اپنے موقعہ پر آئے گی۔

اور حضرتِ یسعیاہ نبی (علیہ السلام) کے صحیفہ میں ہے:-

"دیکھ میں اپنا پیغمبر تیرے آگے بھیجتا ہوں جو تیری راہ تیار کرے گا، بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ خداوند کی راہ تیار کرو، اس کے راستے سیدھے بناؤ۔"[1]

اس بشارت میں "پیغمبر" سے عیسیٰ (علیہ السلام) مراد ہیں اور بیابان میں پکارنے والے حضرتِ یحییٰ علیہ السلام ہیں جو حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے منادی تھے اور ان کی بعثت سے قبل بنی اسرائیل میں اُن کی بعثت و رسالت کا مژدۂ جانفزا سُناتے تھے۔

اور متی کی انجیل میں ہے:-

"جب یسوع، ہیرودیس بادشاہ کے زمانہ میں یہودیہ کے بیت لحم میں پیدا ہوا تو دیکھو کئی مجوس پورب سے یروشلم میں یہ کہتے ہوئے آئے کہ یہودیوں کا بادشاہ جو پیدا ہوا ہے وہ کہاں ہے؟..... یہ سُن کر ہیرودیس بادشاہ اور اس کے ساتھ یروشلم کے سب لوگ گھبرائے اور اس نے قوم کے سب سردار کاہنوں اور فقیہوں کو جمع کر کے اُن سے پوچھا کہ مسیح کی پیدائش کہاں ہونی چاہیئے؟ انھوں نے اس سے کہا کہ یہودیہ کے بیت لحم میں کیونکہ نبی (یسعیاہ علیہ السلام) کی معرفت یوں لکھا گیا ہے، اے بیت لحم یہوداہ کے علاقہ: تو یہوداہ کے حاکموں میں ہرگز سب سے چھوٹا نہیں کیونکہ تجھ میں سے ایک سردار نکلے گا جو میری اُمتِ اسرائیل کی گلہ بانی کرے گا۔"[2]

اور دوسری جگہ ہے:-

اور جب وہ یروشلم کے نزدیک پہنچے اور زیتون کے پہاڑ پر بیت فگے کے پاس آئے تو یسوع نے دو شاگردوں کو یہ کہہ کر بھیجا کہ اپنے سامنے کے گاؤں میں جاؤ وہاں پہنچتے ہی ایک گدھی بندھی ہوئی اور اس کے ساتھ بچہ تمھیں ملے گا انھیں کھول کر میرے پاس لے آؤ اور اگر کوئی تم سے کچھ کہے تو کہنا کہ یہ خداوند کو درکار ہیں وہ فی الفور انھیں بھیجدیگا یہ اس لیے ہوا کہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ صیہون کی بیٹی سے کہو کہ دیکھ تیرا

[1] باب ۴۰ آیات ۸-۳۔ [2] باب ۲۔ آیات ۶-۱۔

بادشاہ تیرے پاس آتا ہے وہ حلیم ہے اور گدھے پر سوار ہے بلکہ لادو بچہ پر۔[1]

اور یوحنا کی انجیل میں ہے :-

اور یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کے لیے اس (یحییٰ علیہ السلام) کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں' انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے، اس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں' پس انھوں نے اُس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا میں جیسا کہ یشعیاہ نبی نے کہا ہے بیابان میں پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔[2]

اور مرقس اور لوقا کی انجیلوں میں ہے :-

وہ لوگ منتظر تھے اور سب اپنے اپنے دل میں یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی بابت سوچتے تھے کہ آیا وہ مسیح تھے یا نہیں تو یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) نے اُن سب کے جواب میں کہا: میں تو تمھیں بپتسمہ دیتا ہوں مگر جو مجھ سے زور آور ہے وہ آنے والا ہے میں اس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے لایق نہیں' وہ تمھیں روح القدس سے بپتسمہ دے گا۔[3]

اِن ہر دو بشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود اپنی مذہبی روایات کی بنا پر جن اولوالعزم پیغمبروں کی بعثت کے منتظر تھے ان میں مسیح علیہ السلام بھی تھے اور حضرت یحییٰ (علیہ السلام) نے اُن کو بتایا کہ وہ نہ ایلیا ہیں نہ وہ نبی اور نہ مسیح (علیہم السلام) بلکہ مسیح علیہ السلام کی بعثت کے منادا اور مُبشّر ہیں۔

قرآنِ عزیز نے بھی حضرتِ زکریا اور حضرتِ یحییٰ (علیہما السلام) کے واقعہ کو

---

[1] باب ۲- آیات ۶-۱- [2] باب ۱- آیات ۲۳-۱۹- [3] لوقا باب ۲ آیات ۱۶-۱۵- [4] عہد۔ مزید (انجیل) میں یوحنا دو جدا جدا شخصیتیں ہیں' ایک یحییٰ علیہ السلام اور دوسری عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور شاگرد۔

حضرتِ عیسیٰ علیہ السّلام کی بعثت کی تمہید قرار دیا ہے اور یحییٰ (علیہ السّلام) کو حضرتِ عیسیٰ (علیہ السّلام) کا مُبشّر اور منادی بتایا ہے۔ آلِ عمران میں ہے:۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ	پس فرشتوں نے اُس (زکریا) کو اس وقت پکارا
يُصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ	جبکہ وہ حجرہ میں کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا تھا بیشک
يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا	اللہ تعالیٰ تجھ کو یحییٰ (فرزند) کی بشارت دیتا ہے، جو
بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ (پ ۳ ع ۴)	اللہ کے کلمہ (عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرے گا۔

ولادتِ مُبارک عابد و زاہد اور عفت مآب مریم (علیہا السّلام) اپنے خلوت کدہ میں مشغولِ عبادت رہتی اور ضروری حاجات کے علاوہ کبھی اس سے باہر نہیں نکلتی تھیں، ایک مرتبہ مسجدِ اقصیٰ (ہیکل) کے مشرقی جانب لوگوں کی نگاہوں سے دور کسی ضرورت سے ایک گوشہ میں تنہا بیٹھی تھیں کہ اچانک خدا کا فرشتہ (جبرئیلؑ) انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔ حضرتِ مریمؑ نے ایک اجنبی شخص کو اس طرح بے حجاب سامنے دیکھا تو گھبرا گئیں اور فرمانے لگیں "اگر تجھ کو کچھ بھی خدا کا خوف ہے تو میں خدائے رحمان کا واسطہ دے کر تجھ سے پناہ چاہتی ہوں" فرشتے نے کہا: "مریم! خوف نہ کھا، میں انسان نہیں بلکہ خدا کا فرستادہ فرشتہ ہوں اور تجھ کو بیٹے کی بشارت دینے آیا ہوں" حضرتِ مریمؑ نے یہ سُنا تو ازراہِ تعجب فرمانے لگیں: میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ مجھ کو آج تک کسی بھی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا اس لیے کہ نہ تو میں نے نکاح کیا ہے اور نہ میں زانیہ ہوں" فرشتہ نے جواب دیا: میں تو تیرے پروردگار کا قاصد ہوں، اُس نے مجھ سے اِسی طرح کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ میں اس لیے کروں گا کہ تجھ کو اور تیرے لڑکے کو کائنات کے لیے اپنی قدرتِ کاملہ کے اعجاز کا "نشان" بنا دوں اور لڑکا میری جانب سے "رحمت" ثابت ہوگا اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو ایک ایسے لڑکے کی بشارت دیتا ہے جو اس کا "کلمہ"[1] ہوگا اُس کا لقب "مسیح"[2] اور اُس کا نام

[1] یعنی توالد و تناسل کے عام قانون سے جدا قانونِ اعجاز کے مطابق محض حکمِ الٰہی اور ارادۂ باری سے ہی رحمِ مریمؑ میں وجود پذیر ہو جائے گا۔ [2] مسیح بمعنی مُبارک یا سیّاح جس کا کوئی گھر نہ ہو۔

عیسیٰ (یسوع) ہوگا اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں باوجاہت اور صاحبِ عظمت رہے گا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہوگا' وہ اللہ تعالیٰ کے نشان کے طور پر بحالتِ شیرخوارگی لوگوں سے باتیں کرے گا اور سن کہولت (بڑھاپے کا ابتدائی دور) بھی پائے گا تاکہ کائنات کی رشد و ہدایت کی خدمت کی تکمیل کرے اور یہ سب کچھ اس لیے ضرور ہو کر رہے گا کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ قدرت یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو اس کا محض یہ ارادہ اور حکم کہ "ہوجا" اس شے کو نیست سے ہست کر دیتا ہے لہٰذا یہ یوں ہی ہو کر رہے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی کتاب عطا کرے گا' اس کو حکمت سکھائے گا اور اُس کو بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے رسول اور اولوالعزم پیغمبر بنائے گا۔

قرآن عزیز نے ان واقعات کا معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ سورۂ آلِ عمران اور سورۂ مریم میں اس طرح ذکر کیا ہے:۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ	(وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جب فرشتوں نے مریم
يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ	سے کہا، اے مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو اپنے کلمہ کی بشارت
عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا	دیتا ہے اس کا نام مسیح، عیسیٰ ابن مریم ہوگا' وہ دنیا
وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ وَ	و آخرت میں صاحبِ وجاہت اور ہمارے مقربین میں
يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا	سے ہوگا اور وہ (ماں کی) گود میں اور کہولت کے
وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى	زمانہ میں لوگوں سے کلام کرے گا اور وہ نیکوکاروں میں
يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ	سے ہوگا۔ مریم نے کہا: میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے
قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ	جبکہ مجھ کو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا فرشتہ نے کہا
اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ	اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اسی طرح پیدا کر دیتا ہے، وہ
كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ	جب کسی شے کے لیے حکم کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے "ہوجا"
وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ	اور وہ ہوجاتی ہے اور اللہ اُس کو کتاب و حکمت اور توراۃ

وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ

(سورۂ آلِ عمران پ ۳ ع ۵)

وانجیل کا علم عطا کرے گا اور وہ بنی اسرائیل کی جانب اللہ کا رسول ہوگا۔

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ مَرْیَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَکَانًا شَرْقِیًّا ۙ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا ۝ قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْکَ اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا ۝ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ ۖ لِاَهَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا ۝ قَالَتْ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَکُ بَغِیًّا ۝ قَالَ کَذٰلِکِ ۚ قَالَ رَبُّکِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَکَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا ۝

(سورۂ مریم پ ۱۶ ع ۱)

اور اے پیغمبر! کتاب میں مریم کا واقعہ ذکر کرو اس وقت کا ذکر جب وہ ایک جگہ پورب کی طرف تھی اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہوئی پھر اس نے ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا، پس ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں نمایاں ہوگیا مریم اسے دیکھ کر گھبرا گئی، وہ بولی اگر تو نیک آدمی ہے تو میں خدائے رحمان کے نام پر تجھ سے پناہ مانگتی ہوں۔ فرشتہ نے کہا میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں اور اس لیے نمودار ہوا ہوں کہ تجھے ایک پاک فرزند دیدوں۔ مریم بولی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں بدچلن ہوں؟ فرشتہ نے کہا: "ہوگا ایسا ہی" تیرے پروردگار نے فرمایا کہ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں وہ کہتا ہے یہ اس لیے ہوگا کہ اس (مسیح) کو لوگوں کے لیے ایک نشان بنادوں اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے ہو چکا ہے۔

جبرئیل امین نے مریم (علیہا السلام) کو یہ بشارات سنا کر اُن کے گریبان میں پھونک دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا کلمہ اُن تک پہنچ گیا۔ مریم (علیہا السلام) نے کچھ عرصہ کے بعد خود کو حاملہ محسوس کیا تو بہ تقاضائے بشری اُن پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی اور اس

کیفیت نے اُس وقت شدید صورت اختیار کرلی، جب انھوں نے دیکھا کہ مدتِ حمل ختم ہو کر ولادت کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جارہا ہے، انھوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعہ قوم کے اندر رہ کر پیش آیا تو چونکہ وہ حقیقتِ حال سے واقف نہیں ہے اس لیے نہیں معلوم وہ کس کس طرح بدنام اور بہتان طرازیوں کے ذریعہ کس درجہ پریشان کرے اس لیے مناسب یہ ہے کہ لوگوں سے دور کسی جگہ چلے جانا چاہیے، یہ سوچ کر وہ یروشلم (بیت المقدس) سے تقریباً نو میل کوہِ سراۃ (ساعیر) کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جو اَب "بیت اللحم" کے نام سے مشہور ہے، یہاں پہنچ کر چند روز بعد دَردِزہ شروع ہوا تو تکلیف و اضطراب کی حالت میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے تنے کے سہارے بیٹھ گئیں اور پیش آنے والے نازک حالات کا اندازہ کر کے انتہائی قلق اور پریشانی کی حالت میں کہنے لگیں "کاش کہ میں اس سے پہلے مرچکی ہوتی اور میری ہستی کو لوگ یک قلم فراموش کرچکے ہوتے" تب نخلستان کے نشیب سے خدا کے فرشتہ نے پکارا "مریمؑ! غمگین نہ ہو، تیرے پروردگار نے تیرے تلے نہر[1] جاری کردی ہے اور کھجور کا تنہ پکڑ کر اپنی جانب ہلا تو پکے اور تازہ خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے پس تو کھا پی اور اپنے بچہ کے نظارہ سے آنکھیں ٹھنڈی کر اور رنج و غم کو بھول جا"

حضرتِ مریمؑ (علیہا السلام) پر تنہائی، تکلیف اور نزاکتِ حال سے جو خوف طاری اور اضطراب پیدا ہوگیا تھا فرشتہ کی تسلی آمیز پکار اور عیسیٰ (علیہ السلام) جیسے برگزیدہ بچہ کے نظارہ سے کافور ہوگیا اور وہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو دیکھ دیکھ کر شاد کام ہونے لگیں۔ تاہم یہ خیال پہلو میں ہر وقت کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا کہ اگرچہ خاندان اور قوم میری عصمت و پاک دامنی سے ناآشنا نہیں ہے پھر بھی اُن کی اِس حیرت کو کس طرح مٹایا جاسکے گا کہ بن باپ کے کس طرح ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوسکتا ہے؟

---

[1] سری لغتِ عرب میں نہر کو بھی کہتے ہیں اور بلند ہستی کو بھی، جمہور نے اس جگہ پہلے معنی مراد لیے ہیں، — اور حسن بصری، ربیع بن انس اور ابن اسلم (رحمہم اللہ) نے دوسرے معنی منقول ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے تیرے تلے ایک بلند ہستی پیدا کردی ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲)

مگر جس خدائے برتر نے اُن کو یہ بزرگی اور برتری بخشی وہ کب ان کو اِس کرب و بے چینی میں مبتلا رہنے دیتا، اس لیے اس نے فرشتہ کے ذریعہ مریم (علیہا السلام) کے پاس پھر یہ پیغام بھیجا کہ جب تو اپنی قوم میں پہنچے اور وہ تجھ سے اس معاملہ کے متعلق سوالات کرے تو خود جواب نہ دینا بلکہ اشارہ سے ان کو بتانا کہ میں روزہ دار ہوں اور اس لیے آج کسی سے بات نہیں کر سکتی تم کو جو کچھ دریافت کرنا ہے اِس بچہ سے دریافت کر لو تب تیرا پروردگار اپنی قدرتِ کاملہ کا نشان ظاہر کر کے اُن کی حیرت کو دُور اور اُن کے قلوب کو مطمئن کر دیگا حضرت مریم (علیہا السلام) وحی الٰہی کے ان پیغامات پر مطمئن ہو کر بچہ کو گود میں لے بیت المقدس کو روانہ ہوئیں، جب شہر میں پہنچیں اور لوگوں نے اس حالت میں دیکھا تو چہار جانب سے ان کو گھیر لیا اور کہنے لگے "مریم! یہ کیا؟ تو نے تو بہت ہی عجیب بات کر دکھائی اور بھاری تہمت کا کام کر لیا، اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدچلن تھی پھر تو یہ کیا کر بیٹھی؟

مریم علیہا السلام نے خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لڑکے کی جانب اشارہ کر دیا کہ جو کچھ دریافت کرنا ہے اس سے معلوم کر لو میں تو آج روزہ[1] سے ہوں۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب کے ساتھ کہا "ہم کس طرح ایسے شیر خوار بچہ سے باتیں کر سکتے ہیں جو ابھی ماں کی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے" مگر بچہ فوراً بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے (اپنے فیصلۂ تقدیر میں) مجھ کو کتاب (انجیل) دی ہے اور نبی بنایا ہے اور اُس نے مجھ کو مُبارک بنایا خواہ میں کسی حال اور کسی جگہ بھی ہوں، اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمت گذار بنایا اور خود سر اور نافرمان نہیں بنایا اور اس کی جانب سے مجھ کو سلامتی کا پیغام ہے جس دن کہ میں پیدا ہوا اور جس دن کہ میں مروں گا اور جس دن کہ پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا" اللہ تعالیٰ نے اِن

---

[1] بنی اسرائیل کے یہاں روزہ میں خاموشی بھی داخلِ عبادت تھی۔

تفصیلات کو سورۂ انبیاء، تحریم اور سورۂ مریم میں ذکر فرمایا ہے :-

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا	اور اس عورت (مریمؑ) کا معاملہ جس نے اپنی پاکدامنی
فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا	کو قائم رکھا، پھر ہم نے اس میں اپنی "روح" کو پھونک دیا
وَابْنَهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝	اور اس کو اور اس کے لڑکے کو جہان والوں کے لیے
(انبیاء پ ۱۷ ع ۷)	"نشان" ٹھہرایا ہے۔
وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ	اور عمران کی بیٹی مریمؑ کہ جس نے اپنی عصمت کو برقرار
فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (تحریم پ ۲۸ ع ۱)	رکھا پس ہم نے اس میں اپنی روح کو پھونک دیا۔
فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا	پھر اُس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھیر گیا وہ (اپنی
قَصِیًّا ۝ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰی	حالت چھپانے کے لیے) لوگوں سے الگ ہو کر دور چلی گئی
جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ یٰلَیْتَنِیْ	پھر اُسے دردِ زہ (کا اضطراب) کھجور کے ایک درخت کے
مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْیًا	نیچے لے گیا (وہ اس کے تنہ کے سہارے بیٹھ گئی) اس نے کہا
مَّنْسِیًّا ۝ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ	کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی، میری ہستی کو لوگ یکسر فراموش
اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ	بھول گئے ہوتے اس وقت (ایک پکارنے والے فرشتے
تَحْتَكِ سَرِیًّا ۝ وَهُزِّیْٓ اِلَیْكِ	نے) اُسے نیچے سے پکارا "غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے
بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ	تیرے تلے نہر جاری کر دی ہے، اور کھجور کے درخت کا تنہ
عَلَیْكِ رُطَبًا جَنِیًّا ۝ فَكُلِیْ	پکڑ کے اپنی طرف ہلا، تازہ اور پکے ہوئے پھلوں کے خوشے
وَاشْرَبِیْ وَقَرِّیْ عَیْنًا ۝ فَاِمَّا	تجھ پر گرنے لگیں گے، کھا پی (اور اپنے بچہ کے نظارے
تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۝	سے) آنکھیں ٹھنڈی کر، پھر اگر کوئی آدمی نظر آئے
فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا	(اور پوچھ گچھ کرنے لگے) تو (اشارہ سے) کہہ دے میں نے
فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا ۝	خدائے رحمان کے حضور روزہ کی منت مان رکھی ہے
فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ	میں آج کسی آدمی سے بات چیت نہیں کر سکتی" پھر

قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا
فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ
اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ
اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ
قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ
فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ
اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِيَ
الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝
وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا
كُنْتُ ۖ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ
وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝
وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ
جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ وَالسَّلٰمُ
عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَ
يَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ
حَيًّا ۝ (سورۂ مریم پ ۱۶ ع)

ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کو ساتھ لے کر اپنی قوم کے پاس آئی،
لڑکا اُس کی گود میں تھا، لوگ (دیکھتے ہی) بول اُٹھے
"مریم! تو نے عجیب ہی بات کر دکھائی اور بڑی تہمت کا
کام کر گذری، اے ہارون[1] کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی
تھا نہ تیری ماں بدچلن تھی۔" (تو یہ کیا کر بیٹھی) اس پر مریمؑ
نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا (کہ یہ تمھیں بتلا دے گا کہ
حقیقت کیا ہے) لوگوں نے کہا: بھلا اس سے ہم کیا بات
کریں جو ابھی گود میں بیٹھنے والا شیر خوار بچہ ہے" مگر لڑکا
بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب
دی اور نبی بنایا، اس نے مجھے بابرکت کیا خواہ میں کسی
جگہ ہوں، اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جب تک
زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو۔ اس نے مجھے اپنی ماں کا
خدمت گذار بنایا، ایسا نہیں کیا کہ خود سر اور نافرمان
ہوتا، مجھ پر اس کی طرف سے سلامتی کا پیغام ہے
جس دن پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور جس دن پھر
زندہ اٹھایا جاؤں گا۔"

قوم نے ایک شیر خوار بچہ کی زبان سے جب یہ حکیمانہ کلام سُنا تو حیرت میں رہ گئی اور اس کو یقین ہو گیا کہ مریم (علیہا السلام) کا دامن بلاشبہ ہر قسم کی بُرائی اور تلویث سے پاک ہے اور اس بچہ کی پیدائش کا معاملہ یقیناً منجانب اللہ ایک "نشان" ہے۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ پوشیدہ رہ جاتی، قریب اور بعید سب جگہ اس حیرت زا واقعہ

---

[1] کہتے ہیں کہ ہارون، مریم علیہا السلام کے خاندان میں ایک عابد و زاہد انسان اور بہت نیک نفس مشہور تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

اور عیسیٰ (علیہ السلام) کی معجزانہ ولادت کے چرچے ہونے لگے اور طبائعِ انسانی نے اس مقدس ہستی کے متعلق شروع ہی سے مختلف کروٹیں بدلنی شروع کردیں، اصحابِ خیر نے اُس کے وجود کو اگر یُمن و سعادت کا ماہتاب سمجھا تو اصحابِ شر نے اُس کی ہستی کو اپنے لیے فالِ بد جانا اور بغض و حسد کے شعلوں نے اندر ہی اندر اُن کی فطری استعداد کو کھانا شروع کردیا۔

غرض اسی متضاد فضا کے اندر اللہ تعالیٰ اپنی نگرانی میں اس مقدس بچہ کی تربیت اور حفاظت کرتا رہا تاکہ اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کے مُردہ قلوب کو حیاتِ تازہ بخشے اور اُن کی روحانیت کے شجرِ خشک کو ایک مرتبہ پھر بار آور اور ثمر بنائے:۔

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً	اور ہم نے عیسیٰ بن مریم اور اُس کی ماں (مریم) کو (اپنی
وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ	قدرت کا) نشان بنا دیا اور ان دونوں کا ایک بلند مقام
قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ۝ (سورۂ مومنون پ ۱۸ ع ۲)	(بیت اللحم) پر ٹھکانا بنایا جو سکونت کے قابل اور چشمہ والا ہے

بشاراتِ ولادت قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بچپن کے حالات میں سے صرف اسی اہم واقعہ کا ذکر کیا ہے باقی بچپن کے دوسرے حالات کو جن کا ذکر قرآن کے مقصدِ تذکیر و موعظت سے خاص تعلق نہیں رکھتا تھا نظر انداز کردیا ہے لیکن اسرائیلیات کے مشہور ناقل

لہ عن ابن عباس فی قولہ "وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ" قال المعین الماء الجاری وھو النھر الذی قال اللہ تعالیٰ "فجعل ربك تحتك سریا" وکذا قال الضحاك وقتادۃ الی ربوۃ ذات قرار و معین ھو بیت المقدس فھذا واللہ اعلم ھو الاظھر لانہ المذکور فی الآیۃ الاخری والقرآن یفسر بعضہ بعضا و ھذا اولی ما یفسر بہ ثم الاحادیث الصحیحۃ ثم الآثار۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۴۶) یعنی حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے آیت "وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ" کی تفسیر میں منقول ہے کہ "معین" سے نہر جاری مراد ہے اور یہ اسی نہر کا ذکر ہے جس کو آیت "قد جعل ربك تحتك سریا" میں بیان کیا گیا ہے اور ضحاک و قتادہ (رحمہما اللہ) کا بھی یہی قول ہے کہ "اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ" سے بیت المقدس کی سرزمین مراد ہے اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے اس لیے کہ دوسری آیت میں بیت المقدس (کی نہر) کا ہی ذکر ہے اور قرآن کا ہر حصہ خود ہی دوسرے حصہ کی تفسیر کردیا کرتا ہے اور تفسیر آیات میں پہلی جگہ اسی طریق تفسیر کو حاصل ہے اس کے بعد صحیح احادیث کے ذریعہ تفسیر کا اور اس کے بعد آثار کے ذریعہ تفسیر کا درجہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت وہب بن منبہ سے جو واقعات منقول ہیں اور متی کی انجیل میں بھی جن کا ذکر موجود ہے اُن میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت ہوئی تو اسی شب میں فارس کے بادشاہ نے آسمان پر ایک نیا ستارہ روشن دیکھا، بادشاہ نے درباری نجومیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ اس ستارہ کا طلوع کسی عظیم الشان ہستی کی پیدائش کی خبر دیتا ہے جو ملکِ شام میں پیدا ہوئی ہے۔ تب بادشاہ نے خوشبوؤں کے عمدہ تحفے دے کر ایک وفد کو ملکِ شام روانہ کیا کہ وہ اس بچہ کی ولادت سے متعلق حالات و واقعات معلوم کریں، وفد جب شام پہنچا تو اُس نے تفتیشِ حال شروع کی اور یہودیوں سے کہا کہ ہم کو اس بچہ کی ولادت کا حال سناؤ جو مستقبلِ قریب میں روحانیت کا بادشاہ ثابت ہوگا۔ یہود نے اہلِ فارس کی زبان سے یہ کلمات سُنے تو اپنے بادشاہ ہیرودیس کو خبر کی، بادشاہ نے وفد کو دربار میں بُلا کر استصوابِ حال کیا اور اُن کی زبانی واقعہ کو سُن کر بہت گھبرایا اور پھر وفد کو اجازت دی کہ وہ اس بچہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں۔ پارسیوں کا یہ وفد بیت المقدس پہنچا اور جب حضرت یسوع (علیہ السلام) کو دیکھا تو اپنے رسم و رواج کے مطابق اوّل اُن کو سجدۂ تعظیم کیا اور پھر مختلف قسم کی خوشبوئیں اُن پر نثار کیں اور چند روز وہیں قیام کیا، دورانِ قیام میں وفد کے بعض آدمیوں نے خواب میں دیکھا کہ ہیرودیس اِس بچہ کا دشمن ثابت ہوگا اس لیے تم اب اس کے پاس نہ جاؤ اور بیت اللحم سے سیدھے فارس کو چلے جاؤ۔ صبح کو وفد نے فارس کا ارادہ کرتے وقت حضرتِ مریم (علیہا السلام) کو اپنا خواب سُناتے ہوئے کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی نیت خراب ہے اور وہ اس مقدس بچہ کا دشمن ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم اس کو ایسی جگہ لے جا کر رکھو جو اُس کی دسترس سے باہر ہو، اِس مشورہ کے بعد حضرتِ مریم (علیہا السلام) یسوع مسیح (علیہ السلام) کو اپنے بعض عزیزوں کے پاس مصر لے گئیں اور وہاں سے ناصرہ چلی گئیں اور جب عیسیٰ علیہ السلام کی عمرِ مبارک تیرہ سال کی ہوئی تو اُن کو ساتھ لے کر دوبارہ بیت المقدس واپس آئیں۔ یہی روایات یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے بچپن کے حالاتِ زندگی بھی غیر معمولی تھے اور اُن سے طرح طرح کے کرامات کا صدور ہوتا رہتا تھا۔[1] (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

حلیۂ مبارک بخاری حدیثِ معراج میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میری مُلاقات حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) سے ہوئی تو میں نے اُن کو میانہ قد سُرخ سپید پایا۔ بدن ایسا صاف شفاف تھا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حمام سے نہا کر آئے ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ آپ کے کاکل کاندھوں تک لٹکے ہوئے تھے، اور بعض احادیث میں ہے کہ رنگ کھلتا ہوا گندم گوں تھا۔ بخاری کی روایت اور اس روایت میں اداء و تعبیر کا فرق ہے، حُسن میں اگر صباحت کے ساتھ ملاحت کی آمیزش بھی ہوتی ہے تو اس رنگ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، کسی وقت اگر سُرخی جھلک آئی تو صباحت نمایاں ہو جاتی ہے اور اگر کسی وقت ملاحت غالب آگئی تو چہرہ پر حسن و لطافت کے ساتھ کھلتا ہوا گندم گوں رنگ چمکنے لگتا ہے۔

بعثت و رسالت حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) سے قبل بنی اسرائیل ہر قسم کی بُرائیوں میں مبتلا تھے اور انفرادی و اجتماعی عیوب و نقائص کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو اُن سے بچ رہا ہو، وہ اعتقاد و اعمال دونوں ہی قسم کی گمراہیوں کا مرکز و محور بن گئے تھے حتیٰ کہ اپنی ہی قوم کے ہادیوں اور پیغمبروں کے قتل تک پر جری اور دلیر ہو گئے تھے، یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے متعلق معلوم کر چکے ہو کہ اس نے حضرتِ یحییٰ (علیہ السلام) کو اپنی محبوبہ کے اشارہ پر کیسے عبرتناک طریقہ پر قتل کرا دیا تھا اور اس نے یہ سفاکانہ اقدام صرف اس لیے کیا کہ وہ حضرتِ یحییٰ کی بڑھتی ہوئی روحانی مقبولیت کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی محبوبہ سے ناجائز رشتہ پر اُن کے نہی عن المنکر (برائی سے بچانے کی ترغیب) کی تاب نہ لا سکا اور یہ عبرتناک سانحہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کی زندگیِ مُبارک ہی میں ان کی بعثت سے قبل پیش آچکا تھا۔

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۷۷ و انجیل متی باب ۲۔

دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا للبستانی) میں یہود سے متعلق جو مقالہ ہے اس کے تاریخی مواد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی بعثت سے پہلے یہود کے عقائد و اعمال کا یہ حال تھا کہ وہ مشرکانہ رسوم و عقائد کو جزءِ مذہب بنا چکے تھے اور جھوٹ، فریب، بغض و حسد جیسی بداخلاقیوں کو تو عملاً اخلاقِ کریمانہ کی حیثیت دے رکھی تھی اور اسی بناء پر بجائے شرمسار ہونے کے وہ اُن پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور ان کے علماء و احبار نے تو دُنیا کے لالچ اور حرص میں کتاب اللہ (توراۃ) تک کو تحریف کیے بغیر نہ چھوڑا اور درہم و دینار پر خدا کی آیات کو فروخت کر ڈالا یعنی عوام سے نذر اور بھینٹ حاصل کرنے کی خاطر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا اور اس طرح قانونِ الٰہی کو مسخ کر ڈالا۔

یہود کی اعتقادی اور عملی زندگی کا مختصر اور مکمل نقشہ ہم کو شعیا (علیہ السلام) کی زبانی خود توراۃ نے اس طرح دکھایا ہے:۔

خداوند فرماتا ہے: یہ اُمت (بنی اسرائیل) زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیونکہ میرے حکموں کو پیچھے ڈال کر آدمیوں کے حکموں کی تعلیم دیتے ہیں۔

بہرحال ان ہی تاریک حالات میں جب حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کے قتل کا واقعہ بھی ہو گذرا اور بنی اسرائیل نے خدا کے حکموں کے خلاف بغاوت و سرکشی کی حد کر دی تب وہ وقتِ سعید آ پہنچا کہ جس مُبارک بچہ نے حضرت مریمؑ کی آغوش میں پیغامِ حق سُنا کر بنی اسرائیل کو حیرت میں ڈال دیا تھا، سنِ رشد کو پہنچ کر اس نے یہ اعلان کر کے کہ وہ خدا کا رسول اور پیغمبر ہے اور رشد و ہدایتِ خلق اُس کا فرضِ منصبی، قوم میں ہلچل پیدا کر دی، وہ شرفِ رسالت سے مشرف ہو کر اور حق کی آواز بن کر آیا اور اپنی صداقت و حقانیت کے نور سے تمام اسرائیلی دنیا پر چھا گیا، اس مقدس ہستی نے قوم کو للکارا اور احبار کی علمی مجلسوں، راہبوں کے خلوت کدوں

بادشاہ اور امراء کے درباروں اور عوام و خواص کی محفلوں میں حتیٰ کہ کوچہ و برزن اور بازاروں میں شب و روز یہ پیغامِ حق سنایا۔

لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا رسول اور پیغمبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہاری اصلاح کی خدمت میرے سپرد فرمائی ہے، میں اس کی جانب سے پیغامِ ہدایت لے کر آیا ہوں اور تمہارے ہاتھ میں خدا کا جو قانون (توراۃ) ہے اور جس کو تم نے اپنی جہالت اور کج روی سے پسِ پشت ڈال دیا ہے میں اُس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس کی مزید تکمیل کے لیے خدا کی کتاب (انجیل) لے کر آیا ہوں، یہ کتاب حق و باطل کا فیصلہ کرے گی اور آج جھوٹ اور سچ کے درمیان فیصلہ ہو کر رہے گا۔ سُنو اور سمجھو اور اطاعت کے لیے خدا کے حضور جُھک جاؤ کہ یہی دین و دنیا کی فلاح کی راہ ہے۔

اب ان حقائق اور ان کے عواقب و نتائج کو قرآن کی زبانی سُنیے اور احقاقِ حق و ابطالِ باطل کے لُطف سے بہرہ مند ہو کر عبرت و موعظت حاصل کیجیے، کیونکہ "مذکیر بایام اللہ" سے قرآن کا مقصدِ عظیم یہی بصیرت و عبرت ہے:۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ	اور بیشک ہم نے موسیٰؑ کو کتاب (توراۃ) عطا کی اور اس کے
وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ	بعد ہم (تم میں) پیغمبر بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریمؑ کو واضح
وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ	معجزے دے کر بھیجا اور ہم نے اس کو روح پاک (جبرئیل) کے
الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ	ذریعہ قوت و تائید عطا کی، کیا جب تمہارے پاس (خدا کا)
الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ	پیغمبر ایسے احکام لے کر آیا جن پر عمل کرنے کو تمہارا دل نہیں
رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ	چاہتا تو تم نے فرد کو شیوہ (نہیں) بنا لیا؟ پس (دو پیغمبروں
اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ	کی) ایک جماعت کو جھٹلاتے ہو تو ایک جماعت کو قتل
وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا	کر دیتے ہو، اور کہتے ہو کہ ہمارے دل (قبولِ حق کے لیے)
قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ	غلاف میں ہیں (یہ نہیں) بلکہ اُن کے کفر کرنے پر خدا نے

بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ۝ (سورۃ البقرہ پ ۱ ع ۱۱)

ان کو ملعون کر دیا ہے پس بہت تھوڑے سے ہیں جو ایمان لے آئے ہیں۔

وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنكَ إِذْ جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ (المائدہ پ ۷ ع ۱۵)

اور (اے عیسیٰ) جب ہم نے بنی اسرائیل (کی گرفت و ارادۂ قتل) کو تجھ سے باز رکھا اس وقت جبکہ تو اُن کے پاس کھلے معجزات لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے منکروں نے، یہ کچھ نہیں ہے مگر کھلا جادو ہے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ ۚ (سورۂ آلِ عمران پ ۳ ع ۶)

اور میں تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور (اس لیے آیا ہوں) تاکہ تمہارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کر دوں جو (تمہاری کجروی کی وجہ سے) تم پر حرام کر دی گئی تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی لے کر آیا ہوں پس اللہ کا خوف کرو اور میری پیروی کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اُسی کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔ پس جبکہ عیسیٰؑ نے اُن سے کفر محسوس کیا تو فرمایا اللہ کے لیے کون میرا مددگار ہے تو شاگردوں نے جواب دیا: ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ ۚ (حدید پ ع)

پھر ان کے بعد (نوح و ابراہیم علیہم السلام کے بعد) ہم نے اپنے رسول بھیجے اور ان کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو رسول بنا کر بھیجا اور اس کو کتاب (انجیل) عطا کی۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ

(وہ وقت یاد کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا "اے عیسیٰ ابن مریم! میری اس نعمت کو یاد کر جو میری جانب سے تجھ پر اور تیری والدہ پر نازل ہوئی

تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيْلَ (سورۃ المائدہ پ ۷ ع)	جبکہ میں نے روح القدس (جبرئیل) کے ذریعہ تیری تائید کی کہ تو کلام کرتا تھا آغوشِ مادر میں اور بڑھاپے میں اور جبکہ میں نے تجھ کو سکھائی کتاب، حکمت، توراۃ اور انجیل۔
وَإِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ أَحْمَدُ (صف پ ۲۸ ع)	اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ ابن مریمؑ نے کہا: اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت سنانے والا ہوں ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

آیاتِ بینات قصص القرآن جلد اوّل معجزات کی بحث میں گذر چکا ہے کہ حق و صداقت کے تسلیم و انقیاد میں انسانی فطرت ہمیشہ سے دو طریقوں سے مانوس رہی ہے: ایک یہ کہ "مدعیِ حق" کی حقانیت و صداقت، دلائل کی قوت اور براہین کی روشنی کے ذریعہ ثابت اور واضح ہو جائے اور دوسرا طریقہ یہ کہ دلائل و براہین کے ساتھ ساتھ منجانب اللہ اس کی صداقت کی تائید میں عام قانونِ قدرت سے جُدا بغیر اسباب و وسائل اور تحصیلِ علم و فن کے اس کے ہاتھ پر امورِ عجیبہ کا مظاہرہ اس طرح ہو کہ عوام و خواص اس کے مقابلہ سے عاجز و درماندہ ہو جائیں اور ان کے لیے اسباب و وسائل کے بغیر ان امور کی ایجاد ناممکن ہو، پہلے طریق کے ساتھ یہ دوسرا طریق انسان کے عقل و فکر اور اس کی نفسیاتی کیفیات میں ایسا انقلاب پیدا کر دیتا ہے کہ ان کا وجدان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ داعیِ حق (نبی و پیغمبر) کا یہ عمل دراصل خود اس کا اپنا فعل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ خدا کی قوت کام کر رہی ہے اور بلاشبہ یہ اس کے صادق ہونے کی مزید دلیل ہے چنانچہ قرآنِ عزیز میں آیت "وَمَا رَمَيْتَ

اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى[1] میں اسی حقیقت کا اظہار مقصود ہے مگر ان ہر دو طریقوں میں سے ان اصحابِ علم و دانش پر جو قوتِ فہم و ادراک میں بلند مقام رکھتے ہیں پہلا طریقہ زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے اور وہ دوسرے طریقہ کو پہلے طریقہ کی تائید و تقویت کی حیثیت سے قبول کرتے اور داعیِ حق (نبی و پیغمبر) کے دعوائے نبوت و رسالت کی صداقت کا مزید علمی ثبوت یقین کر کے اُس پر ایمان لے آتے ہیں اور ان حضرات ارباب عقل و فکر کے برعکس ارباب قوت و اقتدار اور ان کی ذہنیت سے متاثر عام انسانی قلوب دوسرے طریقہ تصدیق سے زیادہ متاثر ہوتے اور نبی و پیغمبر کے معجزانہ افعال کو کائنات کی طاقت و قوت کے دائرہ سے بالاتر ہستی کا ارادہ و قوتِ فعل یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ان اُمور کو خدائی نشان" باور کر کے دعوتِ حق و صداقت کے سامنے تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

قرآن عزیز نے اکثر و بیشتر مقامات پر پہلے طریق دلیل کو "حجۃ اللہ" "برہان" اور "حکمۃ" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ انعام میں خدا کی ہستی، اس کی وحدانیت، معاد و آخرت اور دین کے بنیادی عقائد کو دلائل، نظائر اور شواہد کے ذریعہ سمجھانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے، اللہ کیلئے
الْبَالِغَةُ۔ (پ ۷)	ہی ہے حجتِ کامل (یعنی مکمل اور روشن دلیل)

اور اس سورۃ میں دوسری جگہ حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ میں ہے:۔

تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ	اور یہ ہماری "دلیل" ہے جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی
عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ (پ ۷)	قوم کے مقابلہ میں عطا کی۔

اور سورۂ نساء میں ہے:۔

---

[1] اور اے پیغمبر (بدر کے غزوہ میں) جب تو نے (دشمنوں پر) مٹھی پر خاک پھینکی تھی تو تو نے وہ مشتِ خاک نہیں پھینکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔ مفصل بحث جلد اول میں گذر چکی ہے

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ (پ ۶ ع ۱۰) ..... (ہم نے بھیجے) پیغمبر خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں کی جانب سے خدا پر پیغمبر بھیجنے کے بعد کوئی حجت (دلیل) باقی نہ رہے (کہ ہمارے پاس دلائل کے ذریعہ راہِ مستقیم بتانے کوئی نہ آیا تھا اس لیے ہم دینِ حق کی معرفت سے محروم رہے)

...يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (سورۂ نساء پ ۶ ع ۱۰) ..... "اے لوگو! بیشک تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے برہان (قرآن) آگیا۔

اور سورۂ یوسف میں ہے:۔

لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (سورۂ یوسف پ ۱۲ ع ۶) اگر نہ ہوتی یہ بات کہ دیکھ لی تھی اُس (یوسف) نے اپنے پروردگار کی دلیل۔

اور سورۂ نحل میں ہے:۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۚ اپنے پروردگار کے راستہ کی جانب دعوت و حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور تبادلۂ خیالات کرو ان (مخالفین) کے ساتھ اچھے طریق گفتگو سے۔

اور سورۂ نساء میں ہے:۔

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اور اللہ تعالےٰ نے اتارا تجھ پر کتاب کو اور حکمت کو۔

اسی طرح "حکمت" کا یہ ذکر سورۂ بقرہ آلِ عمران، مائدہ، لقمان، ص، زخرف، احزاب اور قمر میں بہ کثرت موجود ہے اور دوسرے طریق دلیل کو اکثر "آیۃ اللہ" اور "آیات اللہ" اور بعض مقامات پر "آیاتِ بینات" اور "بینات" کہا ہے۔

ناقۂ صالح (علیہ السلام) کے متعلق ارشاد ہے:۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً (اعراف پ ۹ ع) یہ اونٹنی تمہارے لیے (خدا کی جانب سے) ایک "نشان" ہے۔

اور حضرتِ مسیح اور ان کی والدہ مریم (علیہما السلام) کے متعلق ارشاد ہے :-

وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اور ہم نے کر دیا مریم اور اس کے لڑکے عیسیٰ (علیہما السلام)
اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (انبیاء پ ۱۷ ع ۷) کو جہان والوں کے لیے "نشان" (معجزہ)

اور حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے واقعات میں ارشادِ باری ہے :-

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ[1] اور ہم نے موسیٰؑ کو "نو نشان (معجزات) عطا کیے۔

اور حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کو جو معجزات دیے گئے تھے اُن کے متعلق ارشاد ہے :-

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ[2] اور دیے ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو معجزات۔
اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ اُس وقت جبکہ تو اُن کے پاس کھلے معجزات
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے منکروں نے
اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (سورۂ مائدہ پ ۷ ع ۱۶) یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

ہم نے اس مقام پر اکثر و بیشتر کا لفظ قصداً اختیار کیا ہے کیونکہ قرآنِ عزیز کے اسلوبِ بیان سے واقف اس سے بے خبر نہیں ہے کہ اس نے ان الفاظ کے استعمال میں وسعتِ تعبیر سے کام لیا ہے یعنی جبکہ "معجزہ" بھی ایک خاص قسم کا "بُرہان" ہے اور قرآن اور آیاتِ قرآن جس طرح سرتاسر علم و بُرہان ہیں اُسی طرح "معجزہ" بھی ہیں، اس لیے معجزہ پر بُرہان کا اطلاق اور کتاب اللہ کے جملوں پر آیت اور آیات اللہ کا اطلاق مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہے مثلاً حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے دو معجزوں عصا اور یدِ بیضاء کے متعلق سورۂ قصص میں ہے :-

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ[3] پس تیرے رب کی جانب سے یہ دو دلیلیں ہیں۔

اور کتاب اللہ اور اس کے جملوں پر آیت اور آیات کے اطلاقات سے تو قرآن کی کوئی طویل سورۃ بھی خالی ہوگی، تمام قرآن میں جگہ جگہ اس کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے کہ اس کی فہرست مستقل موضوع بن سکتا ہے۔

اس طرح "آیاتِ بینات" کا اگرچہ بکثرت اطلاق کتاب اللہ (قرآن، توراۃ، زبور، انجیل)

[1] سورۂ بنی اسرائیل پ ۱۵ ع ۱۔ [2] سورۂ بقرہ پ ۱ ع ۔ [3] سورۂ قصص ۔ پ ۔ ع ۔

اور ان کی آیات پر ہوا ہے مگر مسطورۂ بالا مقامات کی طرح بعض بعض جگہ اس کو "معجزات" کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

لائقِ توجہ بات اور حقیقتِ معجزات

نبی اور رسول کی بعثت کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور دین و دنیا کی فلاح و خیر کی رہنمائی ہے اور وہ منجانب اللہ وحی کی روشنی میں اِس فرضِ منصبی کو انجام دیتا اور علم و برہان اور حجتِ حق کے ذریعہ راہِ صداقت دکھاتا ہے، وہ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ فطرت اور ماوراءِ فطرت امور میں تصرف و تغیر بھی اُس کا کارِ منصبی ہے بلکہ وہ بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ میں خدا کی جانب سے بشیر و نذیر اور داعی الی اللہ بن کر آیا ہوں، میں انسان ہوں اور خدا کا ایلچی، اس سے زائد اور کچھ نہیں ہوں تو پھر اس کے دعوئے صداقت کے امتحان اور پرکھ کے لیے، اس کی تعلیم، اس کی تربیت اور اس کی شخصیت کا زیرِ بحث آنا یقیناً معقول لیکن اُس سے ماوراءِ فطرت اور خارقِ عادت عجائبات و غرائب کا مطالبہ خلافِ عقل اور بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ کسی طبیبِ حاذق کے دعوئے حذاقتِ طب پر اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ طلسمی کھٹکے کی ایک عمدہ الماری یا لکڑی کا ایک عجیب قسم کا کھلونا بنا کر دکھائے، طبیب نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ ماہر لوہار یا بڑھئی ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو امراضِ جسمانی کے علاج کا ہے، اسی طرح پیغمبرِ خدا کا یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ وہ خدا کی طرح کائنات پر ہر قسم کے تصرف و تغیر کا مالک و قادر ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ تمام امراضِ روحانی کے لیے طبیبِ کامل اور حاذق و ماہر ہے۔

پس دعویٰ نبوت اور معجزات (خارقِ عادات امور) کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اور کیا اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "معجزہ" لوازمِ نبوت میں سے نہیں ہے؟

بلاشبہ یہ سوال بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے اور اس لیے علمِ کلام میں اس مسئلہ کو کافی اہمیت دی گئی ہے لیکن ہم نے "آیاتِ بینات" عنوان کے ماتحت ابتداءِ کلام میں دعوئے نبوت کی صداقت سے متعلق دلائل کی جو تقسیم انسانی طبائع اور ان کے فطری رجحانات کے

پیشِ نظر کی ہے وہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے اور جوہرِ عقل کے تفاوتِ درجات نے بلاشبہ انسانوں کی قوتِ فکریہ کو جدا جدا دو طریقوں کی جانب مائل کر دیا ہے، ان حالات میں جب ایک نبی اور رسول یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خدا کی جانب سے ایک ایسے منصب پر مامور ہے جو ریاضات و مجاہدات اور نیک عملی کی قوت سے نہیں بلکہ محض خدا کی موہبت اور عطا سے حاصل ہوتا ہے اور یہ "منصبِ نبوت و رسالت" ہے اور اس کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور تعلیمِ حق و صداقت ہے تو بعض انسانی دماغ اور ان کا جوہرِ عقل اس جانب متوجہ ہو جاتا ہے کہ اگر اس ہستی کا یہ دعویٰ صحت پر مبنی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ اس درجہ قربت حاصل ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے ناممکن ہے پس جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُس کی صدائے اصلاح اور اس کی تعلیم ہمارے قدیم رسم و رواج یا مذہب و دھرم کے ان عقائد و اعمال کے خلاف ہے جس کو ہم حق سمجھتے آئے ہیں تو ان متضاد اور متخالف تعلیمات کی صداقت و بطالت کے امتحان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ ہستی کوئی اور ماورائے فطرت یا خارقِ عادت امر کر دکھائے تو ہمارے لیے یہ سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا کہ بغیر اسباب و وسائل کے اس ہستی کے ہاتھ ایسے امر کا صدور یقیناً اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ خاص قرب حاصل ہے، تب ہی تو خدائے برحق نے یہ "نشان" دکھا کر اس کی صداقت پر مہر لگا دی، نیز وہ صاحبِ قوت و اقتدار انسان جن کے غور و فکر کی قوت ایسے سانچہ میں ڈھل گئی ہے کہ ان پر کوئی امرِ حق اس وقت تک مؤثر ہی نہیں ہوتا جب تک کہ ان کی متکبرانہ طاقت کو غیبی ٹھوکر سے بیدار نہ کیا جائے، وہ بھی اس کے منتظر رہتے ہیں کہ مدعیِ نبوت و رسالت اپنی صداقت کو دلیل و برہان کے ساتھ ساتھ ایک ایسے "کرشمہ" کے ذریعہ ناقابلِ انکار بنا دے کہ جس کا صدور دوسرے انسانوں سے یا تو ممکن ہی نہ ہو اور یا بغیر اسباب و وسائل کے استعمال کیے وجود پذیر نہ ہو سکتا ہو تاکہ یہ باور کیا جا سکے کہ بلاشبہ اس ہستی کی تعلیم و تبلیغ کو خدائے برتر کی تائید حاصل ہے۔

اسی لیے علماء کلام نے دعوئے نبوت اور معجزہ کے درمیان تعلق پر بحث کرتے ہوئے یہ مثال بیان کی ہے کہ ایک شخص جب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو بادشاہِ وقت نے اپنا نائب مقرر کرکے بھیجا ہے تو اس ملک یا صوبے کے باشندے خواستگار ہوتے ہیں کہ مدعیِ نیابت اپنے دعویٰ کی صداقت کے لیے کوئی سند اور علامت پیش کرے چنانچہ مدعیِ نیابت ایک جانب اگر سند دکھاتا ہے تو دوسری جانب ایسی "نشانی" بھی پیش کرتا ہے جس کے متعلق یہ یقین کیا جاسکے کہ بادشاہ کی عطا کردہ یہ نشانی اس کے عطیہ اور اس منصب کی تصدیق کے علاوہ اور کسی طرح بھی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً بادشاہ کی انگشتری (مہرِ حکومت) یا ایسا خاص عطیہ جو صرف اس منصب پر فائز ہستی کو عطا کیا جاتا ہو۔

تو اگرچہ بظاہر دعویٰ نیابت اور انگشتری یا عطیۂ خاص کے درمیان کوئی مطابقت نہیں ہے تاہم اس تعلقِ خاص نے جو شاہی تصدیق سے وابستہ ہے ان دونوں کے درمیان اہم ربط پیدا کر دیا ہے۔

لیکن جبکہ یہ طریقِ تصدیق، معیارِ صداقت و حقانیت میں دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقۃً معیاری حیثیت صرف طریقِ اوّل "حجۃ و برہانِ حق" کو ہی حاصل ہے اس لیے معجزہ کے وقوع و صدور کا معاملہ پہلے طریق کے وجود و صدور سے قطعاً جُدا ہے اور وہ یہ کہ ہر ایک مدعیِ نبوت و رسالت کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ اپنے دعویِ حق و صداقت کو حجۃ و بُرہان کی روشنی اور علم و یقین کی قوت کے ذریعہ ثابت کرے اور اپنی تعلیم و تربیت، اور شخصی حیات کے ہر پہلو میں دعویٰ اور دلیل و بُرہان کی مُطابقت کو واضح کرے اور انسانی جوہرِ عقل کے فکر و تدبر کی رہنمائی کا فرض اس طرح انجام دے کہ ہر قسم کے ظن و وہم اور فاسد و کاسد خیالات کے مقابلہ میں یقینِ محکم "روزِ روشن" کی طرح نمودار ہو جائے اور اس ادائے فرض کے لیے کسی کی جانب سے نہ مطالبہ شرط ہے اور نہ جستجو لازم بلکہ یہ نبی اور رسول کا براہِ راست وہ فرض ہے جس کے لیے خدائے تعالیٰ نے اس کو منتخب اور مامور کیا ہے اور اگر ایک لمحہ کے لیے بھی

وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو گویا اپنے فرض کی پوری عمارت کو اپنے ہاتھ سے برباد کر دیتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ	اے پیغمبر! جو تم پر نازل کیا گیا ہے تم اس کو
مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا	پورا پورا پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو
بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (سورۃ المائدہ پ ۶ ع)	منصب رسالت کو ادا نہ کیا۔

اِس کے برعکس معجزہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ نبی اور رسول اس کو ضرور ہی دکھائے یا مخالفین کے ہر مطالبہ پر اس کی تعمیل کرے بلکہ "معجزہ" حجت و برہان کی وہ قسم ہے جو اکثر معاندین کے مطالبہ پر وقوع پذیر ہوتا ہے اور اس سے اس کا صدور صرف عالم الغیب کی اپنی "حکمت و مصلحت" پر ہی موقوف رہتا ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ معجزہ کے بارہ میں کس کا سوال جویائے حق کی حیثیت میں ہے اور کس کا تعنت اور انکارِ مزید کے لیے رکن، سعید روحوں پر اس کا یہ اثر پڑے گا کہ وہ کہہ اٹھیں گی "اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى" اور رکن بدبختوں پر اس طرح اثر انداز ہوگا کہ یوں گویا ہوں گے: "اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ"

پس قرآن عزیز نے اگر ایک جانب بہ نصوصِ قطعیہ یہ ظاہر کیا ہے کہ اُس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو حجۃ و برہان کے ساتھ مزید تائید و تقویت کے لیے معجزات عطا کیے ہیں تو دوسری جانب یہ بھی صاف صاف نبی کی زبانی کہلا دیا ہے کہ میں خدا کی جانب سے فقط "نذیر مبین" "بشیر و نذیر" اور "رسول و نبی" ہوں۔ میں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ میں کائنات خداوندی کے تصرفات و تغیرات اور ماوراء فطرت امور پر قادر ہوں، ہاں خدائے برتر اگر چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور اس نے ایسا کیا بھی ہے مگر وہ جب ہی کرتا ہے کہ اس کی حکمت و مصلحت اس کی متقاضی ہو۔

چنانچہ حضرتِ داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو منطق الطیر اور تسخیرِ ہوا، طیور و جن کے نشان دیے گئے، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو "تسع آیات بینات"۔ نو کھلے نشان "عطا کیے گئے، جن میں سے دو نشان عصا اور یدِ بیضاء کو قرآن نے "بڑے نشان" کہا ہے اور

بحرِ قلزم میں غرقِ فرعون اور نجاتِ قومِ موسیٰ کا عجیب و غریب واقعہ مستقل ایک نشانِ عظیم ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر دہکتی آگ کے شعلوں کو "بردوسلام" بنادیا۔ حضرت صالح (علیہ السلام) کی قوم کے لیے "ناقۂ صالح" کو نشان بنایا کہ جوں ہی اس کو کسی نے ستایا اُسی وقت خدا کا عذاب قوم کو تباہ و برباد کر جائے گا چنانچہ ٹھیک اُسی طرح پیش آیا۔

حضرتِ ہود اور حضرتِ نوح (علیہما السلام) سے اُن کی قوموں نے عذاب طلب کیا اور کافی سمجھانے کے بعد بھی جب اُن کا اصرار قائم رہا تو ان پیغمبروں نے عذابِ الٰہی کی جو وعیدیں سُنائی تھیں وہ ٹھیک اپنے اپنے وقت پر پوری ہوئیں حالانکہ ان سب واقعوں میں بظاہر اسبابِ نزولِ عذاب اور وقوعِ حوادث و ہلاکت کے کوئی سامان نہیں تھے اور حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو جو مختلف نشان (معجزات) دیے گئے اُن کو بھی قرآن نے صاف صاف بیان کر دیا ہے جو ابھی زیرِ بحث آئیں گے اور آخر میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی معجزۂ قرآن عطا کیا جس کی تحدی (مقابلہ کے چیلنج) کا کوئی جواب نہ دے سکا، نیز بدر کے معرکہ میں فرشتوں کا نزول اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کی نصرت و یاوری اور "وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ" کے اعلان سے اس مشہور معجزہ کا اظہار فرمایا جس نے بدر کے میدان میں مٹھی بھر خاک کو ایک ہزار دشمنوں کی آنکھوں کا آزار بنا دیا اور شق القمر کا معجزہ عطا فرمایا۔ معاملۂ زیرِ بحث کا یہ ایک پہلو یا ایک رُخ ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ ارشاد و تبلیغِ حق کے روشن دلائل و براہین کا کوئی جواب مخالفین سے نہ بن پڑا تو ازراہِ تعنت و سرکشی عجائبات اور خارقِ عادات امور کا مطالبہ کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ ان کا مقصد طلبِ حق اور جستجوئے صداقت نہیں ہے بلکہ یہ جو کہہ رہے ہیں سرکشی، ضد اور تعصب کی راہ سے کہتے ہیں اس لیے اِن کا جواب یہ نہیں ہے کہ خدا کے نشانات کو بھان متی کا تماشہ یا مداری کا کھیل بنا دیا جائے بلکہ اصل جواب یہ ہے کہ ان سے

کہدو میں ان تصرفات کا مدعی نہیں ہوں میں تو نیک و بد اُمور میں تمیز پیدا کرنے، خدا کے بندوں کا خدا کے ساتھ رشتہ ملانے اور نیک و بد کاموں کے انجام کو واضح کرنے کے لیے نذیر مبین اور نبی رسول ہوں۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا
مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ
لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ
فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ
اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ
عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ
وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ
لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ
اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ
نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ
عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ
قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ
اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (الاسراء پ ۱۵ ع)

اور انھوں نے (مشرکوں نے) کہا، ہم اس وقت تک ہرگز تیری بات نہیں مانیں گے کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ اُبال دے یا تیرے واسطے کھجوروں کا اور انگور کا باغ ہو اور تو اس کے درمیان زمین پھاڑ کر نہریں بہا دے یا تو جیسا گمان کرتا ہے ہمارے اوپر آسمان گرا دے یا تو اللہ اور اس کے فرشتوں کو (ہمارے) مقابل لائے یا تیرے واسطے ایک سونے کا (طلائی) مکان ہو اور یا تو چڑھ جائے آسمان پر اور ہم تیرے چڑھ جانے کو بھی ہرگز اس وقت تک نہیں تسلیم کریں گے تاوقتیکہ تو ہمارے پاس (آسمان سے) کتاب لے کر نہ آئے کہ اس کو ہم پڑھیں (اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے پاک ہے میرے پروردگار کے لیے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان ہوں، خدا کا پیغامبر ہوں۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ
فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۙ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا
سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ
مَّسْحُوْرُوْنَ ۝ (الحجر پ ۱۴ ع)

اور اگر کھول دیں ہم اُن پر آسمان کا ایک دروازہ اور یہ اُس پر چڑھنے لگیں تب بھی ضرور یہی کہیں گے کہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مست کر دی گئی ہیں ہماری آنکھیں بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔

وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ

اور اگر یہ ہر قسم کے نشان بھی دیکھ لیں تب بھی

لَا یُؤْمِنُوْا بِهَا (الانعام پ ۷) (ضد اور تعصب کی بناء پر) ایمان لانے والے نہیں ہیں

اب ان تفصیلات سے یہ بھی بخوبی روشن ہو گیا کہ علم کلام میں جن علماء کی رائے یہ ظاہر کی گئی ہے کہ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہے اُن کی مراد کیا ہے؟ وہ دراصل دعویٰ نبوت کی صداقت سے متعلق مسطورۂ بالا ہر دو دلائل کے فرق کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو ہستی نبوت و رسالت کا دعویٰ کرتی ہے اس پر لازم اور ضروری ہے کہ اپنے دعویٰ کی تصدیق کے لیے "حجۃ و بُرہان" پیش کرے اور دلائل کی روشنی میں اپنی حقانیت کو ثابت کرے اور وحیِ الٰہی کی جو تعلیم وہ کائنات کی ہدایت کے لیے پیش کرتی ہے بُرہان و حجت کے ذریعہ اُس کی حقیقت کو واضح کرے، تو گویا اِس طرح نبوت و رسالت اور حجۃ و بُرہانِ صداقت میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے اس کے برعکس نبوت کے ساتھ معجزات اور آیات اللہ (نشاناتِ خداوندی) کا تعلق اس طرح کا نہیں ہے بلکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مخالفین کے مطالبہ پر یا بہ تقاضائے حکمتِ الٰہی نبی اور رسول از خود اپنی صداقت کی تائید میں کوئی نشان (معجزہ) دکھائے تو بلاشبہ وہ اس ہستی کے نبی و رسول ہونے کی ناقابلِ انکار "دلیل" ہے اور اس کا انکار درحقیقت اس رسول کی صداقت کا انکار ہے کیونکہ اس صورت میں یہ انکار "حقیقت اور واقعہ" کا انکار ہے اور حقیقت کا انکار حق نہیں بلکہ "باطل" ہوتا ہے جو نبوت و رسالت کے مقصد کے ساتھ کسی طرح بھی جمع نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہو کہ تعلیمِ حق کی روشنی، وحیِ الٰہی پر دلائل و براہین کا یقین اور اصولِ دین پر حجۃ و برہان کا قیام ہوتے ہوئے اب مخالفین کے بار بار طلبِ معجزات و عجائبات کی پرواہ نہ کی جائے اور نبی و رسول، وحیِ الٰہی کی روشنی میں حجت و بُرہان کے ذریعہ تعلیمِ حق جاری رکھے اور مخالفین کے جواب میں صاف صاف کہہ دے کہ میں نے ماوراءِ فطرت پر قدرت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا تو اس صورت میں بندوں پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور کسی اُمت اور قوم کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ تعلیمِ حق کے دلائل و براہین اور روشن حجت

وبیتہ سے اس لیے مُنہ پھیرے اور اس لیے اس کا انکار کردے کہ اُس کی طلب پر اچنبھوں اور عجائبات کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا گیا۔

پس قرآنِ عزیز نے جن انبیاء و رُسل کے واقعات و حالات تذکیر بایام اللہ کے سلسلہ میں بیان کرتے ہوئے نصوصِ قطعیہ کے ذریعہ صراحت و وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہم نے اُن کی صداقت کے نشان کے طور پر نشانات (معجزات) اُن کو عطا اور مخالفین کے سامنے ان کا مظاہرہ کیا تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بے چون وچرا اُن کو قبول اور اُن کی تصدیق کریں اور عجائب پرستی کے الزام سے خائف ہو کر عالمِ غیب کی اس تصدیق سے گریز نہ کریں اور نہ رکیک و باطل تاویلات کے پردہ میں اُن کے انکار پر آمادہ ہو جائیں کیونکہ ایسا کرنا اس آیت کا مصداق بن جانا ہے :-

وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ	اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کتابِ الٰہی کے بعض پر ایمان
وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ	لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے
سَبِيلًا (سورہ النساء پ ۶ ع ۲۱)	ہیں کہ ایمان و کفر کے درمیان ایک راہ بنالیں۔

اور ظاہر ہے کہ یہ مومن و مسلم کی نہیں بلکہ کافر و منکر کی راہ ہے، مومن و مسلم کی راہ تو سیدھی راہ یہ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا	اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اسلام میں پوری طرح
فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا	داخل ہو جاؤ (اور اعتقاد و عمل کی ساری باتوں میں مُسلم
تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ	بن جاؤ مُسلم ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ زبان
إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝	سے اسلام کا اقرار کر لو) اور دیکھو شیطانی وسوسوں کی
(سورۃ البقرہ پ ۲ ع ۲۵)	پیروی نہ کرو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔

بہرحال سُنّۃ اللہ یہ جاری رہی ہے کہ جب کسی قوم کی ہدایت یا تمام کائناتِ انسانی کی فوز و فلاح کے لیے نبی اور پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو اس کو منجانب اللہ محکم دلائل و براہین اور آیات اللہ (معجزات) دونوں سے نوازا جاتا ہے، وہ ایک جانب وحیِ الٰہی کے ذریعہ

کائنات کے معاش و معاد سے متعلق اوامر و نواہی اور بہترین دستور و نظام پیش کرتا ہے تو دوسری جانب حسبِ مصلحتِ خداوندی "خدائی نشانات" کا مظاہرہ کرکے اپنی صداقت اور منجانب اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ نیز ہر ایک پیغمبر کو اُسی قسم کے معجزات و نشانات عطا کیے جاتے ہیں جو اس زمانہ کی علمی ترقیوں یا قومی و ملکی خصوصیتوں کے مناسب حال ہونے کے باوجود معارضہ کرنے والوں کو عاجز و درماندہ کردیں اور کوئی ان کے مقابلہ میں تابِ مقاومت نہ لاسکے اور اگر تعصب اور ضد درمیان میں حائل نہ ہوں تو اپنی اکتسابی ترقیوں اور خصوصیتوں کے حقائق سے آگاہ ہونے کی وجہ سے اس اعتراف پر مجبور ہوجائیں کہ یہ جو کچھ سامنے ہے انسانوں کی قدرت سے بالاتر، ان کی دسترس سے باہر، اور صرف خدائے واحد ہی کی جانب سے ہے۔

مثلاً حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کے زمانہ میں علمِ نجوم (ASTRONOMY) اور علمِ کیمیا (CHEMISTRY) کا بہت زور تھا اور ساتھ ہی ان کی قوم کواکب و نجوم کے اثرات کو اُن کے ذاتی اثرات سمجھتی اور ان کو مؤثرِ حقیقی یقین کرکے خدائے واحد کی جگہ ان کی پرستش کرتی تھی اور اُن کا سب سے بڑا دیوتا شمس (سورج) تھا کیونکہ وہ روشنی اور حرارت دونوں کا حامل تھا اور یہی دونوں چیزیں ان کی نگاہ میں کائنات کی بقاء و فلاح کے لیے اصل الاصول تھیں اور اسی بناء پر کرۂ ارضی میں آگ کو اس کا مظہر مان کر اس کی بھی پرستش کی جاتی تھی، علاوہ ازیں ان کو اشیاء کے خواص و اثرات اور اُن کے رد و قبول پر بھی کافی عبور تھا گویا آج کی علمی تحقیقات کے لحاظ سے وہ کیمیاوی طریقہائے عمل سے بھی بڑی حد تک واقف تھے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی ہدایت اور خدا پرستی کی تعلیم و تلقین کے لیے ایک جانب ایسے روشن حجت و برہان عطا فرمائے جن کے ذریعہ وہ قوم کے غلط عقائد کے ابطال اور احقاقِ حق کی خدمت انجام دیں اور مظاہر پرستی کی

وجہ سے حقیقت کے چہرہ پر تاریکی کا جو پردہ پڑ گیا تھا اس کو چاک کر کے رُخِ روشن کو نمایاں کر سکیں "وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ" اور دوسری جانب جب کواکب پرست اور بُت پرست بادشاہ سے لے کر عام افرادِ قوم نے اُن کے دلائل و بُرہان سے لاجواب ہو کر اپنی مادی طاقت کے گھمنڈ پر دہکتی آگ میں جھونک دیا تو اسی خالق اکبر نے جس کی دعوت و ارشاد کی خدمت حضرت ابراہیمؑ انجام دے رہے تھے "كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا" کہہ کر اپنی قدرت کا وہ عظیم الشان نشان (معجزہ) عطا کیا جس نے باطل کے پُر ہیبت ایوان میں زلزلہ پیدا کر دیا اور تمام قوم اس خدائی مظاہرہ سے عاجز، حیران و پریشان اور ذلیل و خاسر ہو کر رہ گئی۔ "وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ"

اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں سحر (MAGIC) مصری علوم و فنون میں بہت زیادہ نمایاں اور امتیازی شان رکھتا تھا اور مصریوں کو فنِ سحر میں کمال حاصل تھا اس لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو قانونِ ہدایت (توراۃ) کے ساتھ ساتھ "یدِ بیضاء" اور "عصا" جیسے معجزات دیے گئے اور حضرت موسیٰؑ نے ساحرینِ مصر کے مقابلہ میں جب ان کا مظاہرہ کیا تو سحر کے تمام اربابِ کمال اس کو دیکھ کر یک زبان ہو کر پکار اُٹھے کہ بلاشبہ یہ سحر نہیں، یہ تو اس سے جدا اور انسانی طاقت سے بالاتر مظاہرہ ہے جو خدائے برحق نے اپنے سچے پیغمبروں کی تائید کے لیے اُن کے ہاتھ پر کرایا ہے کیونکہ ہم سحر کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور یہ کہہ کر انھوں نے فرعون اور قومِ فرعون کے سامنے بے خوفی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ وہ آج سے موسیٰؑ اور ہارونؑ کے خدائے واحد ہی کے پرستار ہیں "فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ" مگر فرعون اور امرا دربار اپنی بدبختی سے یہی کہتے رہے "قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ" "فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ"

اسی طرح حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں علمِ طب (MEDICAL SCIENCE) اور علم الطبیعات (PHYSICS) کا بہت چرچا تھا اور یونان کے اطباء و حکماء (فلاسفر) کی طب و حکمت گرد و پیش کے ممالک و امصار کے اربابِ کمال پر بہت زیادہ اثر انداز تھی اور ملکوں میں صدیوں سے بڑے طبیب اور فلسفی اپنی حکمت و دانش اور کمالاتِ طب کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر خدائے واحد کی توحید اور دینِ حق کی تعلیم سے خواص و عوام یکسر محروم تھے اور خود بنی اسرائیل بھی جو کہ نبیوں کی نسل میں ہونے پر ہمیشہ فخر کرتے رہتے تھے جن گمراہیوں میں مبتلا تھے سطورِ گذشتہ میں اُن پر روشنی پڑ چکی ہے۔

پس اِن حالات میں "سنۃ اللہ" نے جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو رشد و ہدایت کے لیے منتخب کیا تو ایک جانب ان کو حجت و برہان (انجیل) اور حکمت سے نوازا تو دوسری جانب زمانہ کے مخصوص حالات کے مناسب چند ایسے نشان (معجزات) بھی عطا فرمائے جو اُس زمانہ کے اربابِ کمال اور اُن کے پیروؤں پر اِس طرح اثر انداز ہوں کہ جویائے حق کو اِس اعتراف میں کوئی جھجک باقی نہ رہے کہ بلاشبہ یہ اعمال اکتسابی علوم سے جُدا محض خدائے تعالیٰ کی جانب سے رسولِ برحق کی تائید میں رونما ہوئے ہیں اور متعصب اور متمرد کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ رہے کہ ان کو "صریح جادو" کہہ کر اپنے بغض و حسد کی آگ کو اور مشتعل کرے۔

عیسیٰ (علیہ السلام) کے ان معجزات میں سے جن کا مظاہرہ انھوں نے قوم کے سامنے کیا قرآنِ عزیز نے چار معجزات کا بصراحت ذکر کیا ہے (۱) وہ خدا کے حکم سے مُردہ کو زندہ (۲) اور پیدائشی نابینا کو بینا اور جذامی کو چنگا کر دیا کرتے تھے (۳) وہ مٹی سے پرند بنا کر اس میں پھونک دیتے تھے اور خدا کے حکم سے اس میں روح پڑ جاتی تھی (۴) وہ یہ بھی بتا دیا کرتے تھے کہ کس نے کیا کھایا اور خرچ کیا اور کیا گھر میں ذخیرہ محفوظ رکھا ہے؟

قوموں میں ایسے مسیحا موجود تھے جن کے علاج و معالجے اور اکتسابی تدابیر سے

مایوس مریض شفا پاتے تھے اُن میں ماہر طبیعات ایسے فلسفی بھی کم نہ تھے جو روح و مادہ کے حقائق اور ارضی و سماوی اشیاء کی ماہیات پر بے نظیر نظریات و تجربیات کے مالک سمجھے جاتے تھے اور حقائقِ اشیاء میں اُن کی باریک بینی اور مہارت اربابِ کمال کے لیے باعثِ صد نازش تھی لیکن جب ان کے سامنے عیسیٰ (علیہ السلام) نے اسباب و وسائل اختیار کیے بغیر ان اُمور کا مظاہرہ کیا تو ان پر بھی ہدایت و ضلالت کی قدرتی تقسیم کے مطابق یہی اثر پڑا کہ جس شخص کے قلب میں حق کی طلب موجزن تھی اس نے اقرار کیا کہ بلاشبہ اس قسم کا مظاہرہ انسانی دسترس سے باہر اور نبیِ برحق کی تائید و تصدیق کے لیے منجانب اللہ ہے اور جن دلوں میں رعونت، حسد اور بغض و عناد تھا ان کے تعصب نے وہی کہنے پر مجبور کیا جو ان کے پیشرو انبیاء و رُسل سے کہتے آئے تھے "اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ"۔

چوتھے معجزے کے بارے میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے مظاہرہ کی وجہ یہ پیش آئی کہ مخالفین جب ان کی دعوتِ رشد و ہدایت سے نفور ہو کر ان کو جھٹلاتے اور ان کے پیش کردہ آیاتِ بینات (معجزات) کو سحر اور جادو کہتے تو ساتھ ہی ازرہِ تمسخر یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ اگر تم خدائے تعالیٰ کے ایسے مقبول بندے ہو تو بتاؤ آج ہم نے کیا کھایا ہے اور کیا بچا رکھا ہے تب عیسیٰ (علیہ السلام) ان کے تمسخر کو بخیدگی سے بدل دیتے اور وحیِ الٰہی کی نصرت سے ان کے سوال کا جواب دیدیا کرتے تھے۔[1]

مگر قرآنِ حکیم نے اس معجزہ کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس کو غور کے ساتھ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس "نشان" کے مظاہرہ کی وجہ مفسرین کی بیان کردہ توجیہ سے زیادہ دقیق اور وسیع معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ عیسیٰ (علیہ السلام) پیغامِ ہدایت و تبلیغِ حق کی خدمت انجام دیتے ہوئے اکثر و بیشتر لوگوں کو دُنیا میں انہماک، دولت و ثروت کے لالچ، اور عیش پسند زندگی کی رغبت سے باز رکھنے پر مختلف اسالیبِ بیان کے ذریعہ توجہ دلایا کرتے تھے تو جس طرح بعض سعید روحیں اس کلمۂ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتی تھیں

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۸۲۔

اس کے برعکس شریر النفس انسان اُن کے مواعظِ حسنہ سے قلبی نفرت و اعراض کے باوجود امتثالِ امر کرنے والی ہستیوں سے زیادہ ان کو یہ باور کراتیں کہ ہم تو ہمہ وقت آپ کے اس ارشاد کی تعمیل میں سرگرم رہتے ہیں لہٰذا قدرتِ حق نے یہ فیصلہ کیا کہ ان منافقین کی منافقت کی مضرت کو زائل کرنے کے لیے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو ایسا "نشان" عطا کیا جائے کہ اس ذریعہ سے حق و باطل منکشف ہو جائے اور حقوق اللہ اور حقوقِ انسانی کے اتلاف پر جو ذخیرہ اندوزی کا سامان کیا جا رہا ہے اس کا پردہ چاک کر دیا جائے۔

اِن چہارگانہ خدائی نشان (معجزات) کے علاوہ خود حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش بھی ایک عظیم الشان "خدائی نشان" تھا جس کے متعلق ابھی تفصیلات سُن چکے ہو۔

حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے ہاتھ پر جن معجزات کا ظہور ہوا یا اُن کی ولادت جس معجزانہ طریق پر ہوئی یہود نے ازرہِ حسد اُن کا انکار کیا تو کیا لیکن بعض فطرت پرست مدعی اسلام حضرات نے بھی اُن کے انکار کے لیے راہ پیدا کرنے کی ناکام سعی فرمائی ہے، اُن میں سے بعض حضرات وہ ہیں جنھوں نے اس انکار کو ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ فطرت پرست اور منکرینِ خدا یورپین علماء جدید سے مرعوبیت کی بناء پر یہ روش اختیار کی ہے تاکہ ان کی مذہبیت پر عجائب پرستی کا الزام عائد نہ ہو سکے، ان میں سرسید اور مولوی چراغ علی صاحب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں اور بعض وہ یہود صفت اشخاص ہیں جو اپنی ذاتی غرض اور ناپاک مقصد کی خاطر ازرہِ حسد و بغض حضرتِ مسیح کے ان معجزات کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ تاویلاتِ باطل کے پردہ میں اُن کا مضحکہ اُڑاتے ہیں، ان میں سے متنبی کاذب مرزا کادیانی اور مسٹر محمد علی لاہوری خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

کادیانی اور لاہوری نے تو یہ ظلم کیا ہے کہ حضرتِ مسیح کے معجزہ "اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ" کے متعلق یہ کہدیا کہ مسیح کا یہ عمل ایک تالاب کی مٹی کا رہینِ منت تھا، معجزہ کچھ نہیں تھا، اس تالاب کی مٹی کی یہ

خاصیت تھی کہ جس کسی پرند کی شکل بنائی جاتی اور مُنہ سے دُم تک سوراخ رکھ دیا جاتا تو ہوا بھر جانے سے اس میں آواز بھی پیدا ہو جاتی تھی اور حرکت بھی گویا العیاذ باللہ! ان بدبختوں کے نزدیک حضرت مسیحؑ کی جانب سے منکروں کے مقابلہ میں یہ معجزانہ صداقت نہیں تھی بلکہ مداری یا شعبدہ باز کا تماشہ تھا۔

اِسی طرح احیاءِ موتیٰ (مُردہ کو زندہ کر دینا) کے معجزہ کا بھی انکار کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآنِ عزیز نے یہ فیصلہ سُنا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ موت کے بعد کسی کو اِس دنیا میں قبل از قیامت زندگی نہیں بخشے گا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ اگر پورے قرآن کو از اوّل تا آخر پڑھ لیا جائے تو کسی ایک آیت میں بھی آپ کو یہ فیصلہ نہیں ملے گا بلکہ اس دعویٰ کے خلاف متعدد مقامات پر اس کا اثبات پائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں موت دینے کے بعد حیاتِ تازہ بخشی ہے مثلاً سورۂ بقرہ کی آیات ذبحِ بقرہ کے واقعہ میں ارشاد ہے:

"فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى"[1] یا سورۂ بقرہ ہی کی اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے: "فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ"[2] (الآیہ) یا اِسی سورۃ میں تیسری جگہ مذکور ہے:

"وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا"[3] چنانچہ اِن تمام واقعات میں "احیاءِ موتیٰ" کے صاف اور صریح معانی ثابت ہیں اور جن حضرات نے ان مقامات میں احیاءِ موتیٰ سے مجازی یا کنائی معنیٰ لیے ہیں اُن کو طرح طرح کی تاویلات کی پناہ لینی پڑی ہے مگر اُن کی تاویلات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احیاءِ موتیٰ کی یہ تاویل اِس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں

---

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بحث گذر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو قصص القرآن ج ۲۔ [2] ایضاً۔
[3] قصص القرآن جلد اوّل میں بحث گذر چکی۔

کہ قرآن کے نزدیک اس کا دنیا میں وقوع ممنوع ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ آیاتِ مسطورۂ بالا کے سیاق و سباق کے پیشِ نظر یہی معنی مناسب حال ہیں۔

غرض یہ دعویٰ کہ قرآن ممنوع قرار دیتا ہے کہ دارِ دُنیا میں "احیاءِ موتیٰ" وقوع پذیر ہو صرف مرزا کادیانی اور مسٹر لاہوری کے دماغ کی اُپج ہے جو قطعاً باطل اور غیر ثابت ہے اور اس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے، رہا یہ امر کہ خدا کے عام قانونِ فطرت کے ماتحت ایسا نہیں پیش آتا رہتا سو اگر ایسا ہوتا رہتا تو پھر یہ "معجزہ" ہرگز نہ کہلاتا اور خدائے برتر کا قانونِ خاص جو تصدیقِ انبیاء علیہم السلام کے مقصد سے کبھی کبھی مخالفین کے مقابلہ میں بطور تحدی (چیلنج) کے پیش آتا رہا ہے کوئی خصوصیت نہ رکھتا۔

اِسی طرح حضرتِ مسیحؑ کی بن باپ پیدائش کے مسئلہ کا بھی انکار کیا گیا ہے اور کادیانی اور لاہوری نے بھی اس کے خلاف بے دلیل ہرزہ سرائی کی ہے لیکن اس مسئلہ کی موافق و مخالف آراء سے قطع نظر ایک غیر جانبدار منصف جب حضرتِ مسیحؑ کی پیدائش سے متعلق تمام آیاتِ قرآنی کا مطالعہ کرے گا تو اُس پر یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جائے گی کہ قرآن حضرتِ مسیحؑ سے متعلق یہود کی تفریط اور نصاریٰ کی افراط دونوں کے خلاف اپنا وہ فرضِ منصبی ادا کرنا چاہتا ہے جس کے لیے قرآن کی دعوتِ حق کا ظہور ہوا ہے، یہود اور نصاریٰ اس بارہ میں دو قطعاً مخالف اور متضاد سمتوں میں چلے گئے ہیں، یہود کہتے ہیں کہ حضرتِ مسیح علیہ السلام مفتری اور کاذب اور شعبدہ باز تھے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ وہ خدا، خدا کے بیٹے یا ثالثِ ثلثہ تھے، ان حالات میں قرآن نے ان اوہام و ظنون کے خلاف علم و یقین کی راہ دکھاتے ہوئے دونوں کے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ راہِ حق افراط و تفریط کے درمیان ہے اور صراطِ مستقیم کی یہی سب سے بڑی شناخت ہے۔

وہ کہتا ہے واضح رہے کہ حضرتِ مسیحؑ مفتری اور کاذب نہیں تھے بلکہ خدا کے سچے پیغمبر اور راہِ حق کے داعیِ صادق تھے، انھوں نے دعوتِ حق کی تصدیق کے لیے جو بعض

عجیب باتیں کر دکھائیں وہ معجزاتِ انبیاء کی فہرست میں شامل ہیں نہ کہ ساحروں اور شعبدہ بازوں کی، اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی مگر اس سے یہ کیسے لازم آسکتا ہے کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہو گئے، کیا جو شخص پیدائش کا محتاج ہو اور پیدائش میں بھی ماں کے پیٹ کا محتاج اور جو شخص بشری لوازم کھانے پینے کا محتاج ہو وہ عبد اور بشر کے ماسوا خدا، یا معبود ہو سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ نصاریٰ نے حضرتِ مسیح علیہ السلام کے متعلق الوہیت کا جو عقیدہ قائم کیا تھا اس کا بہت بڑا سہارا یہی واقعہ تھا جیسا کہ وفدِ نجران اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی باہمی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے۔

تو جبکہ قرآن نے یہود و نصاریٰ کے ان تمام باطل عقائد کی واضح الفاظ میں تردید کر کے جو انھوں نے حضرتِ مسیحؑ کے متعلق قائم کر لیے تھے اپنا فریضۂ اصلاح انجام دیا، یہ کیسے ممکن تھا کہ اگر بن باپ کے پیدائش کا واقعہ باطل اور غیر واقعی تھا اور جو سہارا بن رہا تھا الوہیتِ مسیحؑ کا، اس کے متعلق واضح طور سے قرآن تردید نہ کرتا بلکہ اس کے برعکس وہ جگہ جگہ اس واقعہ کو ٹھیک اس طرح بیان کرتا جاتا جیسا کہ متی کی انجیل میں بیان کیا گیا ہے، اس کا فرض تھا کہ سب سے پہلے اسی پر ضرب کاری لگاتا اور صرف اس قدر کہہ کر کہ حضرتِ مسیحؑ کا باپ فلاں شخص تھا اس ساری عمارت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا جس پر الوہیتِ مسیحؑ کی بنیاد رکھی گئی ہے مگر اس نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ یہ بات کسی طرح بھی مسیحؑ کی الوہیت کی دلیل نہیں بن سکتی، کیوں؟ اِس لیے کہ مَثَلَ عِیسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" پس اگر بن باپ کی پیدائش، مسیحؑ کو درجۂ الوہیت دے سکتی ہے تو آدمؑ کو اس سے زیادہ الوہیت کا حق حاصل ہے کہ وہ بن ماں باپ کے پیدا ہوا ہے۔

بہرحال جن تاویل پرستوں نے حضرتِ مسیحؑ کی بن باپ پیدائش سے متعلق آیات کے

جملوں کو جُدا جُدا کر کے غلط احتمالات پیدا کیے ہیں وہ اِس لیے باطل ہیں کہ جب اِس واقعہ سے متعلق آیات کو یکجا کر کے مُطالعہ کیا جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی آیات کے معانی میں بن باپ پیدائش کے معنی کے ماسوا دوسرے کسی بھی احتمال کی گنجائش باقی نہیں رہتی مگر یہ کہ عربی زبان کے الفاظ کے معین مدلولات و اِطلاقات میں تحریفِ معنوی پر بیجا جسارت کی جائے۔

نیز بقول مولانا ابوالکلام جن اصحاب نے بغیر باپ کے پیدائش سے متعلق آیات میں تاویلِ باطل کی ہے اُن کی دلیل کا مدار صرف اِس بات پر ہے کہ حضرتِ مریمؑ کا نکاح اگرچہ یوسف سے ہو چکا تھا مگر رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی، ایسی صورت میں میاں بیوی کے درمیان مقاربت گو شریعتِ موسوی کے خلاف نہیں تھی تاہم وقت کے رسم و رواج کے قطعاً خلاف تھی اس لیے حضرتِ مسیحؑ کی پیدائش لوگوں پر گراں گذری، لیکن اوّل تو اِس واقعہ کا ثبوت ہی موجود نہیں سب بے سند بات ہے دوسرے یہودیوں نے حضرتِ مریمؑ پر جو بہتان لگایا تھا "انسائیکلوپیڈیا آف بائیبل" میں تصریح ہے کہ اِس بہتان کی نسبت ایک شخص پینتھراٹائی کی جانب کی تھی نہ کہ یوسفِ نجار کی جانب، اسلیے تاویل کی یہ بُنیاد ہی از سرتاپا غلط اور بے اصل ہے۔[1]

علاوہ ازیں جہاں تک اس مسئلہ کا عقلی پہلو ہے سو عقل بھی اس کے امکان کو ممنوع اور محال قرار نہیں دیتی بلکہ اس کو ممکن الوقوع تسلیم کرتی ہے، کیا سائنس کی موجودہ دُنیا سے آشنا حضرات اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ آج جبکہ سائنس کی جدید تحقیق نے نظریوں سے آگے قدم بڑھا کر مشاہدہ اور تجربہ سے یہ ثابت کر دیا کہ دوسرے حیوانات کی طرح انسان کی خلقت، پیدائش بھی بیضہ سے ہوتی ہے اور اس کو اصطلاح میں خلیۂ تخم کہتے ہیں، یہ خلیہ مرد اور عورت دونوں میں ہوتا ہے اور حمل قرار پا جانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مرد کے خلیاتِ تخم عورت کے بیضہ میں داخل ہو جاتے ہیں، یہی خلیۂ زندگی اور حیات کا تخم ہے

[1] ترجمان القرآن ج ۳ ۔ ۲ خلیہ کو انگریزی میں (CATL) کہتے ہیں۔

اور قدرتِ حق نے اس کو بہت باریک جُثہ عطا فرمایا[1] ہے تو اس تحقیق نے امریکہ اور انگلینڈ کے سائنسدانوں کو اِس جانب متوجہ کر دیا ہے کہ کیوں وہ ایک ایسی کوشش نہ کریں کہ بغیر مرد کی مقاربت کے جنسِ رجال کے خلیاتِ تخم کو آلات کے ذریعہ جنسِ اناث کے مبیض میں داخل کر کے "وجودِ انسانی" حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ سائنس والوں کا یہ تخیل ابھی عملی حیثیت سے کتنا ہی دور ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ عقل یہ ممکن سمجھتی ہے کہ انسانی پیدائش آنکھوں دیکھے عام طریقِ ولادت کے علاوہ بعض دوسرے طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے اور ان کو قانونِ قدرت کے خلاف اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے قدرت کے تمام قوانین کا احاطہ نہیں کر لیا ہے بلکہ انسان جس قدر علم و دانش کی جانب بڑھتا جاتا ہے اس کے سامنے قدرتِ حق کے قانون کے نئے نئے گوشے کھُلتے جاتے ہیں۔

پس اگر یہ صحیح ہے کہ جو بات کل ناممکن نظر آتی تھی آج وہ ممکن کہی جا رہی ہے اور جلد یا بدیر اُس کے وقوع پر یقین کیا جا رہا ہے تو نہیں معلوم پھر اُس قانونِ قدرت سے انکار کر دینے کے کیا معنی ہیں جس کا علم اگرچہ ابھی تک ہم کو حاصل نہیں ہے مگر انبیاء و رسل جیسی قدسی صفات ہستیوں پر اس علم کی حقیقت آشکارا ہے تو کیا علمی دلیل کا یہ بھی کوئی پہلو ہے کہ جس بات کا ہم کو علم نہ ہو اور عقل اُس کو ناممکن اور محال نہ ثابت کرتی ہو اُس کا انکار صرف "عدمِ علم" کی وجہ سے کر دیا جائے خصوصاً جب یہ انکار ایک مدعیِ مسیحیت و نبوت کی جانب سے ہو تو اُس کے لیے تو یہی کہا جا سکتا ہے۔

اب ان "آیاتِ بینات" کو قرآنِ حکیم سے سُنیے اور موعظت و عبرت کے حصُول کا سر و سامان کیجیے کہ ماضی کے اِن واقعات کی تذکیر سے قرآن کا یہی عظیم مقصد ہے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ	اور خدا سکھاتا ہے اس (عیسٰی) کو کتاب، حکمت، توراۃ
وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ	اور انجیل، اور وہ رسول ہے بنی اسرائیل کی جانب
اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ	(وہ کہتا ہے) کہ بیشک میں تمہارے پاس تمہارے

[1] اس کا قطر انچ کا ۔۔۔ ہوتا ہے۔

أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ
كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ
فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ
وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ
وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُنَبِّئُكُمْ
بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي
بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ
إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ وَ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ
التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي
حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ
مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُونِ ۝ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي
وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا
صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝

(سورۂ آلِ عمران پ ۳ ع ۶)

پروردگار کی جانب سے "نشان" لے کر آیا ہوں، وہ
یہ کہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرند کی شکل بناتا پھر اُس میں
پھونک دیتا ہوں اور وہ خدا کے حکم سے زندہ پرند بن جاتا
ہے اور پیدائشی اندھے کو سوانکھا کر دیتا اور سپید داغ
کے جذام کو اچھا کر دیتا ہوں، اور خدا کے حکم سے مُردہ
کو زندہ کر دیتا ہوں، اور تم کو بتا دیتا ہوں جو تم کھا کر
آتے ہو اور جو تم گھر میں ذخیرہ رکھ آتے ہو، سو اگر تم حقیقی
ایمان رکھتے ہو تو بلاشبہ ان اُمور میں (میری صداقت اور
منجانب اللہ ہونے کے لیے) "نشان" ہے اور میں تورات
کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے اور اس
لیے بھیجا گیا ہوں) تاکہ بعض اُن چیزوں کو جو تم پر حرام ہو گئی
ہیں تمہارے لیے حلال کر دوں تمہارے لیے پروردگار ہی
کے پاس سے "نشان" لایا ہوں، پس تم اللہ سے ڈرو،
اور (اُس کے دیے ہوئے احکام میں) میری اطاعت کرو،
بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، سو اُسی
عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔

وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ
كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي
فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ
طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ
الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ

اور (اے عیسیٰ ابن مریم! تو میری اس نعمت کو یاد کر) جبکہ
تو میرے حکم سے گارے سے پرند کی شکل بنا دیتا اور پھر
اس میں پھونک دیتا تھا اور وہ میرے حکم سے زندہ پرند
بن جاتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے پیدائشی اندھے کو
سوانکھا اور سپید داغ کے کوڑھ کو اچھا کر دیتا تھا اور جبکہ

وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِیْ۔ (سورۂ مائدہ پ ۷)	تو میرے حکم سے مُردہ کو زندہ کر کے قبر سے نکالتا تھا۔
فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ۝ (سورۂ الصف پ ۲۸ ع ۱)	پھر جب وہ (عیسیٰ علیہ السلام) اُن کے پاس کھُلے نشان لے کر آیا تو انھوں نے (بنی اسرائیل نے) کہا "یہ تو کھُلا ہوا جادو ہے"۔

انبیاء (علیہم السلام) نے جب کبھی بھی قوموں کے سامنے آیات اللہ کا مظاہرہ کیا ہے تو منکروں نے ہمیشہ اُن کے متعلق ایک بات ضرور کہی ہے "یہ تو کھُلا ہوا جادو ہے"۔ پس کیا ایک جویائے حق اور غیر متعصب انسان کے لیے یہ جواب اِس جانب رہنمائی نہیں کرتا کہ انبیاء علیہم السلام کے اس قسم کے مظاہرے ضرور عام قوانینِ قدرت سے جُدا ایسے علم کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے تھے جو صرف ان قدسی صفات ہستیوں کے لیے ہی مخصوص رہا ہے اور اِن کے علاوہ انسانی دُنیا اس کے فہمِ حقیقت سے بہرہ مند نہیں ہوئی تب ہی اُن لوگوں کے پاس جو از رہِ عناد و ضد انکار پر تُلے ہوئے تھے اس کے انکار کے لیے اِس سے بہتر دوسری تعبیر نہیں تھی کہ وہ ان امور کو "سحر و جادو" کہہ دیں۔ لہٰذا ان اُمور کو سحر و جادو کہنا بھی ان کے "معجزہ" اور "نشانِ خداوندی" ہونے کی زبردست دلیل ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور اُن کی تعلیمات کا خُلاصہ

بہرحال حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بنی اسرائیل کو حُجّت و بُرہان اور آیات اللہ کے ذریعہ دینِ حق کی تعلیم دیتے رہتے اور ان کے بھُولے ہوئے سبق کو یاد دلا کر مُردہ قلوب میں حیاتِ تازہ بخشتے رہتے تھے۔

خدا اور خدا کی توحید پر ایمان، انبیاء و رسل (علیہم السلام) کی تصدیق، آخرت (معاد) پر ایمان، ملائکۃ اللہ پر ایمان، قضاء و قدر پر ایمان، خدا کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان، اخلاقِ حسنہ کے اختیار، اعمالِ سیئہ سے پرہیز و اجتناب، عبادتِ الٰہی سے رغبت، دُنیا میں انہماک سے نفرت اور خدا کے کنبہ (مخلوقِ خدا) سے محبت و مودت یہی وہ تعلیم و

تلقین تھی جو اُن کی زندگی کا مشغلہ اور فرضِ منصبی بنا ہوا تھا وہ بنی اسرائیل کو توراۃ، انجیل، اور حکیمانہ پند و نصائح کے ذریعہ ان امور کی جانب دعوت دیتے مگر بدبخت یہود اپنی فطرت کج صدیوں کی مسلسل سرکشی اور تعلیم الٰہی سے بغاوت کی بدولت اس درجہ متشدد ہو گئے تھے اور انبیاء و رسل کے قتل نے اُن کے قلوب کو حق و صداقت کے قبول میں اس درجہ سخت بنا دیا تھا کہ ایک مختصر سی جماعت کے علاوہ ان کی جماعت کی بڑی اکثریت نے ان کی مخالفت اور ان کے ساتھ حسد و بغض کو اپنا شعار اور اپنی جماعتی زندگی کا معیار بنا لیا اور اس لیے انبیاء کی سنتِ راشدہ کے مطابق رشد و ہدایت کے حلقہ بگوشوں میں دُنیوی جاہ و جلال کے لحاظ سے کمزور و ناتواں اور زیرِ دست پیشہ ور طبقہ کی اکثریت نظر آتی تھی، ضعفاء کا یہ طبقہ اگر اخلاص و دیانت کے ساتھ حق کی آواز پر لبیک کہتا تو بنی اسرائیل کا وہ سرکش و مغرور حلقہ ان پر اور خدا کے پیغمبر پر پھبتیاں کستا، توہین و تذلیل کا مظاہرہ کرتا اور اپنی عملی جد و جہد کا بڑا حصہ معاندت و مخالفت میں صرف کرتا رہتا تھا:

وَلَمَّا جَآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ	اور جب عیسیٰ ظاہر دلائل لے کر آئے تو کہا: بلاشبہ
قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ	میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لیے
وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ	آیا ہوں تاکہ ان بعض باتوں کو واضح کر دوں جن کے
تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ	متعلق تم آپس میں جھگڑ رہے ہو، پس اللہ سے ڈرو اور
وَاَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ	میری اطاعت کرو، بیشک اللہ تعالیٰ ہی میرا اور
وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ	تمہارا پروردگار ہے سو اس کی پرستش کرو یہی سیدھی
مُّسْتَقِيْمٌ ۝ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ	راہ ہے" پھر وہ آپس میں گروہ بندی کرنے لگے سو
مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا	ان لوگوں کے دردناک عذاب کے ذریعہ ہلاکت اور
مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ (زخرف پ۲۵)	خرابی ہے۔
وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ	اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝[1]

اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئیگا نام اُس کا احمد ہے، پس جب عیسیٰ علیہ السلام آیا اُن کے پاس معجزات لے کر تو وہ (بنی اسرائیل) کہنے لگے یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

(سورۂ آلِ عمران پ ۳ ع)

پھر جب عیسیٰ نے اُن بنی اسرائیل سے کفر محسوس کیا تو کہا "اللہ کی جانب میرا کون مددگار ہے۔" حواریوں نے جواب دیا "ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار۔ ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور تم گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں، اے ہمارے پروردگار جو تو نے اُتارا ہے ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم نے رسول کی پیروی اختیار کرلی پس تو ہم کو (دینِ حق کی) گواہی دینے والوں میں سے لکھ لے۔

حواری عیسیٰ علیہ السلام مگر عیسیٰ (علیہ السلام) معاندین و مخالفین کی دراندازیوں اور ہرزہ سرائیوں کے باوجود اپنے فرضِ منصبی "دعوۃ الی الحق" میں سرگرمِ عمل رہتے اور شب و روز بنی اسرائیل کی آبادیوں اور بستیوں میں پیغامِ حق سُناتے اور روشن دلائل اور واضح آیات اللہ کے ذریعہ لوگوں کو قبولِ حق و صداقت پر آمادہ کرتے رہتے تھے اور خدا اور حکمِ خدا سے سرکش اور باغی انسانوں کی اس بھیڑ میں ایسی سعید رُوحیں بھی نکل آتی تھیں جو عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعوتِ حق پر لبیک کہتی اور سچائی کے ساتھ دینِ حق کو قبول کرلیتی تھیں، ان ہی پاک بندوں میں وہ مقدس ہستیاں بھی تھیں جو حضرت عیسیٰ کے شرفِ صحبت سے فیضیاب ہوکر

[1] سورہ الصف پ ۲۸ ع ۱۔

نہ صرف ایمان ہی لے آئی تھیں بلکہ دینِ حق کی سربلندی اور کامیابی کے لیے انھوں نے جان و مال کی بازی لگا کر خدمتِ دین کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا اور اکثر و بیشتر حضرت مسیحؑ کے ساتھ رہ کر تبلیغ و دعوت کو سرانجام دیتی تھیں، اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ "حواری" (رفیق) اور "انصار اللہ" (اللہ کے دین کے مددگار) کے مقدس القاب سے معزز و ممتاز کی گئیں چنانچہ ان بزرگ ہستیوں نے پیغمبرِ خدا کی حیاتِ پاک کو اپنا اُسوہ بنایا اور سخت سے سخت اور نازک سے نازک حالات میں بھی اُن کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہر طرح معاون و مددگار ثابت ہوئیں:

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ	اور (اے عیسٰی وہ وقت یاد کرو) جبکہ میں نے حواریوں
اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ قَالُوْٓا	کی جانب (تیری معرفت) یہ وحی کی کہ مجھ پر اور میرے
اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا	پیغمبر پر ایمان لاؤ تو انھوں نے جواب دیا ہم ایمان
مُسْلِمُوْنَ ۝ (سورۂ مائدہ پ ۷)	لائے اور اے خدا! تو گواہ رہنا کہ ہم بلاشبہ مسلمان ہیں۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ	اے ایمان والو! تم اللہ کے (دین کے) مددگار ہو جاؤ
اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ	جیسا کہ عیسٰی ابن مریمؑ نے جب حواریوں سے کہا:
لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ	"اللہ کے راستہ میں کون میرا مددگار ہے"۔۔۔ تو
قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ	حواریوں نے جواب دیا "ہم ہیں اللہ (کی راہ)
فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	کے مددگار پس بنی اسرائیل کی ایک جماعت
وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ	ایمان لائی اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا سو ہم نے
اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا	مومنوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی
ظٰهِرِيْنَ ۝ (الصف پ ۲۸)	پس وہ (مومن) غالب رہے۔

گذشتہ سطور میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ عیسٰی (علیہ السلام) کے یہ حواری بیشتر غریب اور مزدور طبقہ میں سے تھے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ کے ساتھ "سنۃ اللہ" یہی جاری رہی ہے کہ ان کی صدائے حق پر لبیک کہنے اور دینِ حق پر جان سپاری کا مظاہرہ

کرنے کے لیے اوّل غریب اور کمزور طبقہ ہی آگے بڑھتا ہے اور زیرِ دست ہی فدا کاری کا ثبوت دیتے ہیں اور وقت کی صاحبِ اقتدار اور زیرِ دست ہستیاں اپنے غرور اور گھمنڈ کے ساتھ مقابلہ اور معارضہ کے لیے سامنے آتی اور معاندانہ سرگرمیوں کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کی راہ میں سنگِ گراں بن جاتی ہیں لیکن جب خدائے تعالیٰ کا قانونِ پاداشِ عمل اپنا کام کرتا ہے تو نتیجہ میں فلاح و کامرانی ان کمزور فدایانِ حق ہی کا حصہ ہو جاتا ہے اور متکبر و مغرور ہستیاں یا ہلاکت کے قعرِ مذلت میں جا گرتی ہیں اور یا مقہور و مغلوب ہو کر سرنگوں ہو جانے کے ماسوا کوئی چارۂ کار نہیں دیکھتیں۔

حواری عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن و انجیل کا موازنہ

قرآن عزیز نے عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواریوں کی منقبت بیان کی ہے، سورۂ آلِ عمران کی آیات تمہارے سامنے ہیں، حضرتِ مسیح (علیہ السلام) جب دینِ حق کی نصرت و یاری کے لیے پکارتے ہیں تو سب سے پہلے جنھوں نے "نحن انصار اللہ" کا نعرہ بلند کیا وہ یہی پاک ہستیاں تھیں، سورۂ صف میں اللہ رب العلمین نے جب مسلمانوں کو مخاطب کر کے "کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ" کی ترغیب دی تو تذکیر بایام اللہ کے پیشِ نظر ان ہی مقدس ہستیوں کا ذکر کیا اور ان ہی کی مثال اور نظیر دیکر نصرتِ حق کے لیے برانگیختہ کیا اور سورۂ مائدہ میں اُن کے قبولِ ایمان اور دعوتِ حق کے سامنے انقیاد و تسلیم کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی اُن کے خلوص، حق طلبی اور حق کوشی کی زندہ جاوید تصویر ہے۔ یہ سب کچھ تو اس وقت کا حال ہے جب تک حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ان کے درمیان موجود ہیں لیکن آپ کے "رفع الی السماء" کے بعد بھی ان کی پُر استقامت اور دینِ قویم کی فدا کارانہ خدمت کے متعلق سورۂ صف کی آیت "فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّھِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰھِرِیْنَ" میں کافی اشارہ موجود ہے اور شاہ عبد القادر (نور اللہ مرقدہ) نے اسی بنا پر آیتِ زیرِ بحث کی تفسیر کرتے ہوئے تاریخی شہادت کا اِس طرح ذکر فرمایا ہے:

حضرتِ عیسیٰ کے بعد ان کے یاروں (حواریوں) نے بڑی محنتیں کی ہیں تب ان کا دین

نشر ہوا، ہمارے حضرت کے پیچھے بھی حنفیوں نے اس سے زیادہ کیا۔

مگر اس کے برعکس بائبل (انجیل) بعض مقامات میں اگر ان کی منقبت اور مدح سرائی میں رطب اللسان ہے تو دوسری جانب ان کو بزدل اور منافق ثابت کرتی ہے۔ انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے مشہور و معتمد علیہ حواری یہودا کے متعلق اس وقت کا حال جب حضرت یسوع (علیہ السلام) کو یہودی گرفتار کرنا چاہتے ہیں' اس طرح مذکور ہے:

یہ باتیں کہہ کر یسوع اپنے دل میں گھبرایا اور یہ گواہی دی کہ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑا دیگا۔ شاگرد شبہ کرکے کہ وہ کس کی نسبت کہتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے..... ایک شخص جس سے یسوع محبت کرتا تھا..... اس نے یسوع کی چھاتی کا سہارا لے کر کہا اے خداوند وہ کون ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ جسے میں نوالہ ڈبو کر دیدوں گا وہی ہے' پھر اس نے نوالہ ڈبو دیا اور لے کر شمعون اسکریوتی کے بیٹے یہوداہ کو دیدیا اور اس نوالہ کے بعد شیطان اس میں سما گیا۔[1]

اور انجیل متی میں اُس شمعون پطرس حواری کے متعلق جو "بقول اناجیل ساری عمر حضرت یسوع کا پیارا اور معتمد علیہ رہا" یہ مسطور ہے:-

شمعون پطرس نے اس سے کہا' اے خداوند تو کہاں جاتا ہے' یسوع نے جواب دیا کہ جہاں میں جاتا ہوں اب تو میرے پیچھے نہیں آسکتا مگر بعد میں میرے پیچھے آئیگا۔ پطرس نے اس سے کہا اے خداوند میں اب تیرے پیچھے کیوں نہیں آسکتا' میں تو تیرے لیے اپنی جان دوں گا' یسوع نے جواب دیا، کیا تو میرے لیے اپنی جان دے گا؟ میں تجھ سے سچ سچ کہتا ہوں کہ مرغ بانگ نہ دے گا جب تک کہ تو تین بار میرا انکار نہ کرے گا۔[2]

اور اسی متی کی انجیل میں تمام شاگردوں (حواریوں) کی بزدلی اور حضرت یسوع کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو جانے کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

"اس پر سارے شاگرد اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔"[3]

[1] باب ۱۳ آیات ۲۷-۲۱۔ [2] متی باب ۲۷ آیت ۳۶۔ [3] باب ۲۶ آیت ۵۶

اِن حوالجات سے تین ایسی باتیں ثابت ہوتی ہیں جن کو کسی طرح بھی عقل و نقل تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اوّل یہ کہ جو شاگرد اور حواری حضرت یسوع کے زیادہ قریب، ان کے معتمد علیہ اور ان کی نگاہوں میں محبوب تھے وہ نتیجہ میں نہ صرف بزدل بلکہ "منافق" نکلے مگر عقل و نقل کا فیصلہ یہ ہے کہ اگرچہ ہر ایک پیغمبر اور مصلح کی جماعت میں ایک چھوٹا سا گروہ منافقین کا عموماً ہوتا ہے جو اپنی دُنیوی اغراض کی خاطر بہ کراہتِ قلب ظاہر داری کے طور پر شریکِ جماعت ہونا مفید سمجھتا ہے مگر ایک مصلح اور پیغمبر کے درمیان ہمیشہ سے یہ فرق رہا ہے کہ مصلح خواہ اپنی جماعت کے منافقین سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکے لیکن نبی اور پیغمبر کو "وحی الٰہی" کے ذریعہ شروع ہی سے مخلص اور منافق کی اطلاع دیدی جاتی ہے تاکہ ایک منکر و کافر سے زیادہ جس گروہ سے جماعتِ حق اور اس کی دعوت و اصلاح کو ضرر پہنچ سکتا ہے، نبی اُس کے حالات سے غافل نہ رہے۔ پس اسی پر کوئی منافق کسی وقت اور کسی حالت میں بھی نبی اور پیغمبر کا محبوب، معتمد علیہ اور مقرب نہیں ہو سکتا، البتہ یہ ایک جدا امر ہے کہ نبی، دینِ حق کی مصالح کی وجہ سے اس کے ساتھ اعراض اور درگذر کا طریقِ عمل مناسب سمجھے جیسا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے ایک صحابی کے اس سوال پر کہ جب آپ منافقین کے حالاتِ منافقت سے آگاہ ہیں تو اُن کا مقابلہ کر کے کیوں اُن کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچا دیتے تاکہ جماعتِ مسلمین کو اُن کی منافقت سے نجات ملے" یہ جواب دیا: "اس لیے کہ ان کے قبولِ ایمان کی ظاہر داری کے بعد ہمارے سخت گیر طریقہ کے متعلق غیر مسلموں کو یہ دھوکا نہ ہو کہ وہ کہہ اٹھیں "محمدؐ اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرنے سے نہیں چوکتے"۔

دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ یہوداہ کے اندر شیطان نے اس وقت حلول کیا جب حضرت یسوع نے اپنے ہاتھ سے اس کو نوالہ ڈبو کر دیا، مگر یہ بات بھی اس لیے عقل نقل کے خلاف ہے کہ بزرگوں اور مقدس انسانوں کے ہاتھوں سے جو کچھ ہوتا ہے اس کا اثر برکت، طہارت اور تقدیس تو ہوا کرتا ہے لیکن شیطان کا حلول اور بدی کا نفوذ نہیں

ہوا کرتا، بیشک یہ درست ہے کہ جب حق کا ترازو قائم ہوتا ہے تو اس سے کھرا اور کھوٹا دونوں کی حقیقت کا انکشاف ہو جایا کرتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اس پیمانہ کے سن کرنے سے کسی کھرے میں کھوٹ پیدا ہو جائے اور انجیل کے اس بیان میں صورتِ حال پہلی نہیں بلکہ دوسری ہے۔

تیسری بات یہ کہ حضرتِ یسوع کے تمام اُن حواریوں میں سے "جن کی مدح وستایش میں جگہ جگہ بائبل رطب اللسان ہے" ایک، دو، یا دس پانچ نہیں سب کے سب نہایت بزدلی اور غداری کے ساتھ اس وقت حضرتِ مسیحؑ سے کنارہ کش ہو گئے، جب دینِ حق کی حمایت ونصرت کے لیے سب سے زیادہ اُن کی ضرورت تھی اور جب کہ پیغمبرِ خدا (علیہ الصلوٰۃ والسلام) دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے ہوئے تھے۔

مگر انجیل کی اِس شہادت کے خلاف سورۂ آلِ عمران میں قرآنِ عزیز نے یہ شہادت دی ہے کہ اس نازک وقت میں جب حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے حواریوں کو دینِ حق کی نصرت وہواری کے لیے پکارا تو سب نے اولوالعزمی اور فداکارانہ جذبہ کے ساتھ یہ جواب دیا: "نحن انصار اللہ" اور پھر حضرتِ مسیحؑ کے سامنے اپنی استقامتِ دین اور اپنے مخلصانہ ایمان کے متعلق شہادت دے کر نصرت کا پورا پورا یقین دلایا اور پھر سورۂ صف میں قرآنِ عزیز نے یہ بھی ظاہر کیا کہ ان حواریوں نے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) سے جو کچھ کہا تھا ان کی موجودگی میں اور ان کے بعد سچی وفاداری کے ساتھ نباہا اور بلاشبہ مومنینِ صادقین ثابت ہوئے اور اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کی مدد فرمائی اور ان کو دشمنانِ حق کے مقابلہ میں کامیاب کیا۔

انجیل اور قرآن کے اِس موازنہ کو دیکھ کر ایک انصاف پسند یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس معاملہ میں "حق" قرآن کے ساتھ ہے اور علماءِ نصاریٰ نے انجیل میں تحریف کر کے اِس قسم کے گھڑے ہوئے واقعات کا اضافہ اِس لیے کیا ہے تاکہ صدیوں بعد کے خود ساختہ

عقیدہ عقیدۂ صلیبِ مسیح سے متعلق یہ داستان صحیح ترتیب پر قائم ہو سکے کہ جب مسیح (علیہ السلام) کو صلیب پر لٹکایا گیا تو انھوں نے یہ کہتے کہتے جان دیدی "ایلی ایلی لما سبقتنی" اے خدا اے خدا! تو نے مجھے کیوں یکہ و تنہا چھوڑ دیا" اور کسی ایک شخص نے بھی مسیح کا ساتھ نہ دیا۔ بہرحال حواریوں سے متعلق بائبل کی یہ تصریحات محرّف اور خود ساختہ داستان سرائی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

نزولِ مائدہ مخلص اور فداکار حواریوں کی جماعت اگرچہ صادق الایمان اور راسخ الاعتقاد تھی مگر علمی و مجلسی تکلفاتِ گفت و شنید کے لحاظ سے سادہ لوح اور ضروریاتِ زندگی کے سر و سامان کے اعتبار سے غربا اور ضعفاء کی جماعت تھی اس لیے انھوں نے ازراہِ سادگی و سادہ دلی حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) سے یہ درخواست کی کہ جس خدائے برتر میں یہ لامحدود طاقت ہے کہ اس کا ایک نمونہ آپ کی ذاتِ اقدس اور وہ نشان (معجزات) ہیں خدائے تعالیٰ نے جن کو آپ کی تصدیقِ نبوّت و رسالت کے لیے آپ کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا اُس خدا میں یہ طاقت بھی ضرور ہوگی کہ وہ ہمارے لیے غیب سے ایک دسترخوان نازل کر دیا کرے تاکہ ہم روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہو کر باطمینانِ قلب یادِ خدا اور دینِ حق کی دعوت و تبلیغ میں مصروف رہا کریں۔ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہ سُن کر اُن کو نصیحت فرمائی کہ اگرچہ خدا کی طاقت بے غایت اور بے نہایت ہے لیکن کسی سچّے بندہ کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ اس طرح خدا کو آزمائے، پس خدا سے ڈرو اور ایسے خیالات سے بچو، یہ سُن کر حواریوں نے جواب دیا "ہم اور خدا کو آزمائیں، حاشا ہمارا تو یہ مقصد نہیں، ہمارا تو یہ مطلب ہے کہ رزق کی جدوجہد سے دل کو مطمئن کر کے خدا کے اِس عطیہ کو زندگی کا سہارا بنالیں اور آپ کی تصدیق میں ہم کو حق الیقین کا اعتقادِ راسخ حاصل ہو جائے اور ہم اس کی خدائی پر کائناتِ انسانی کے لیے شاہدِ عدل بن جائیں"۔

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے جب اُن کا بڑھتا ہوا اِصرار دیکھا تو بارگاہِ الٰہی میں دعا،

کی "اے خدا! تو ان کے سوال کو پورا کر اور آسمان سے ایسا مائدہ (دسترخوانِ نعمت) نازل فرما کہ وہ ہمارے لیے تیرے غضب کا مظہر ثابت نہ ہو بلکہ ہمارے اوّل و آخر سب کے لیے خوشی کی یادگار (عید) بن جائے اور تیرا "نشان" کہلائے اور اس ذریعہ سے ہم کو اپنے غیبی رزق سے شاد کام کرے کیونکہ تو ہی بہتر رزق رساں ہے" اس دعاء کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی: عیسیٰ تمہاری دعاء قبول ہے، میں اس کو ضرور نازل کرونگا لیکن یہ واضح رہے کہ اس کھلی نشانی نازل ہونے کے بعد اگر ان میں سے کسی نے بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی تو پھر ان کو عذاب بھی ایسا ہولناک دوں گا جو کائنات کے کسی انسان کو نہیں دیا جائے گا۔ قرآنِ عزیز نے نزولِ مائدہ کے واقعہ کا اِس معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ ذکر کیا ہے:-

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ	اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ حواریوں نے کہا تھا اے
مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ	عیسیٰ بن مریم! کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ آسمان سے
اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ	ہم پر ایک خوان اتار دے؟ (یعنی ہماری غذا کیلئے آسمان سے
السَّمَآءِ ۭ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ	غیبی سامان کر دے) عیسیٰ نے کہا خدا سے ڈرو (اور ایسی
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا نُرِيْدُ	فرمائشیں نہ کرو) اگر تم ایمان رکھتے ہو، انھوں نے کہا (مقصود
اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا	اس سے قدرتِ الٰہی کا امتحان نہیں ہے بلکہ) ہم چاہتے ہیں
وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ	(یہیں غذا میسر آئے تو) اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل رام
نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝	پائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہمیں سچ بتایا تھا اور اس پر ہم گواہ
قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ	ہو جائیں۔ اس پر عیسیٰ بن مریم نے دعا کی "اے اللہ! اے ہمارے
رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ	پروردگار! ہم پر آسمان سے ایک خوان بھیج دے کہ اُس کا آنا
السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا	ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں سب کے لیے عید
وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا	قرار پائے اور تیری طرف سے (فضل و کرم کی) ایک نشانی ہو۔

وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ قَالَ	ہمیں روزی دے تو سب سے بہتر روزی دینے والا
اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ	ہے اللہ نے فرمایا میں تمہارے لیے خوان بھیجوں گا،
يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ	لیکن جو شخص اس کے بعد بھی (راہِ حق سے) انکار کریگا تو
عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ	میں اسے (پاداش عمل میں) عذاب دوں گا، ایسا عذاب کہ تمام
الْعٰلَمِيْنَ ۝ (سورۂ مائدہ پ ۷ ع ۱۵)	دنیا میں کسی آدمی کو بھی ویسا عذاب نہیں دیا جائے گا۔

یہ مائدہ نازل ہوا یا نہیں؟ قرآنِ عزیز نے اِس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں بیان کی اور نہ کسی مرفوع حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ پایا جاتا ہے، البتہ آثارِ صحابہ و تابعین (رضی اللہ عنہم) میں ضرور تفصیلات مذکور ہیں :-

مجاہد اور حسن بصری (رحمہم اللہ) فرماتے ہیں کہ مائدہ کا نزول نہیں ہوا اس لیے کہ خدائے تعالیٰ نے اس کے نزول کو جس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا طلب کرنے والوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ انسان ضعیف البنیان اور کمزوریوں کا مجسمہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لغزش یا معمولی خلاف ورزی کی بدولت اس دردناک عذاب کے سزاوار ٹھیریں اپنے سوال کو واپس لے لیا، علاوہ ازیں اگر مائدہ کا نزول ہُوا ہوتا تو وہ ایسا نشانِ الٰہی (معجزہ) تھا کہ نصاریٰ اس پر جس قدر بھی فخر کرتے وہ کم تھا اور ان کے یہاں اس کی جس قدر بھی شہرت ہوتی وہ بے جا نہیں ہوتی تاہم ان کے یہاں اس نزولِ مائدہ کا اس طرح کوئی تذکرہ نہیں پایا جاتا۔[1]

اور حضرتِ عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) اور حضرتِ عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا اور مائدہ کا نزول ہوا، جمہور کا رجحان اسی جانب ہے، البتہ اس کے نزول کی تفصیلات میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں مثلاً صرف ایک دن نازل ہوا یا چالیس روز تک نازل ہوتا رہا؟ اور پھر اُترنا بند ہو گیا تو کیوں؟ اور صرف یہی ہوا

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۱۱۶ مگر یوحنا کی انجیل باب ۶ میں تو یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ "عیدِ فصح" کے موقع پر پیش آیا۔

کہ نازل نہ ہوا، یا جن لوگوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے بند ہوا ان پر سخت قسم کا عذاب بھی آپہنچا؛ جو نقول یہ کہتی ہیں کہ مائدہ کا نزول صرف ایک دن نہیں بلکہ چالیس دن تک برابر جاری رہا، وہ بند ہو جانے کا سبب یہ بیان کرتی ہیں کہ نزولِ مائدہ پر حکم یہ ہوا کہ اس کو فقیر، مسکین اور مریض ہی کھائیں تونگر اور بھلے چنگے نہ کھائیں مگر چند روز تعمیل کے بعد لوگوں نے آہستہ آہستہ اس کی خلاف ورزی شروع کر دی، یا یہ حکم ملا تھا کہ اس کو کھائیں سب مگر اگلے روز کے لیے ذخیرہ نہ کریں مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کی خلاف ورزی ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مائدہ کا نزول ہی بند ہو گیا بلکہ خلاف ورزی کرنیوالے خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ کر دیے گئے۔[1]

بہرحال اِن آثار میں جو قدرِ مشترک ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعا قبول فرمائی تو مشیتِ باری کا یہ حکم ہوا کہ مائدہ طیار ہو چنانچہ لوگوں کی آنکھوں دیکھتے خدا کے فرشتہ فضاءِ آسمانی سے اس کو لے کر اُترے اِدھر فرشتے آہستہ آہستہ اس کو لیے ہوئے اتر رہے تھے اور اُدھر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ درگاہِ الٰہی میں دست بدعا تھے کہ مائدہ آپہنچا اور حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے اوّل دو رکعت نمازِ شکر ادا کی اور پھر مائدہ (خوان) کو کھولا تو اس میں تلی ہوئی مچھلیاں اور تر و تازہ پھل اور روٹیاں موجود پائیں اور خوان کھولتے ہی ایسی نفیس خوشبو نکلی کہ اس کی مہک نے سب کو مست کر دیا، حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کھائیں مگر لوگوں نے اصرار کیا کہ ابتداء آپ کریں، آپ نے ارشاد فرمایا، یہ میرے لیے نہیں ہے، تمہاری طلب پر نازل ہوا ہے، یہ سُن کر سب گھبرائے کہ نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو کہ خدا کا رسول تو نہ کھائے اور ہم کھائیں، آپ نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا "اچھا فقراء، مساکین، معذورین اور مریضوں کو بُلاؤ، یہ اُن کا حق ہے، تب ہزار ہا بندگانِ خدا نے شکم سیر ہو کر کھایا مگر مائدہ کی مقدار میں کوئی فرق

---

[1] نزولِ مائدہ کا سوال اگرچہ کیا تھا حواریوں نے مگر کیا تھا سب کی جانب سے اس لیے یہ واضح رہے کہ جن نقول میں خلاف ورزی اور اس سے متعلق عذاب کا ذکر ہے ان کا اشارہ حواریوں میں سے کسی کی جانب مطلق نہیں ہے کیونکہ یہ بات نصوصِ قرآنی کے خلاف ہے۔

نہیں آیا۔[1]

اس مسئلہ میں حضرتِ شاہ عبدالقادر (نوراللہ مرقدہٗ) مجاہد اور حسن بصری (رحمہم اللہ) کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں اور نزولِ مائدہ سے متعلق ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک اور لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں۔ موضح القرآن میں ہے:۔

(ھل یستطیع) "ہو سکے" یہ معنی کہ ہمارے واسطے تمہاری دعا سے اس قدر خرقِ عادت کرے یا نہ کرے فرمایا (اتقوا اللہ) "ڈرو اللہ سے" یعنی بندہ کو چاہیئے کہ اللہ کو نہ آزمائے کہ میرا کہا مانتا ہے یا نہیں اگرچہ خداوند (آقا و مالک) بہتیری مہربانی کرے "وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ" یعنی برکت کی امید پر مانگتے ہیں اور (تاکہ) معجزہ ہمیشہ مشہور رہے۔ آزمانے کو نہیں کہتے ہیں۔ وہ خوان اترا یکشنبہ کو وہ نصاریٰ کی عید ہے جیسے ہم کو روزِ جمعہ۔ بعضے کہتے ہیں۔ وہ خوان اُترا چالیس روز تک اور پھر بعض نے ناشکری کی یعنی حکم ہوا تھا کہ فقرا اور مریض کھاویں نہ محظوظ (توانگر) اور چنگے پھر قریب اسّی آدمی سُور اور بندر ہو گئے (مگر) یہ عذاب پہلے یہود میں ہوا تھا پیچھے کسی کو نہیں ہوا۔[2]

اور بعضے کہتے ہیں (مائدہ) نہ اُترا، تہدید سُن کر مانگنے والے ڈر گئے نہ مانگا لیکن پیغمبر کی دعا عبث نہیں اور اس کلام (قرآن) میں نقل کرنا بے حکمت نہیں، شاید اس دعا کا اثر یہ ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ کی اُمت (نصاریٰ) میں آسودگی مال سے ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پاوے۔ اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرقِ عادت کی راہ سے نہ چاہے پھر اس کی شکر گذاری بہت مشکل ہے، اسبابِ ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے۔ اس قصہ میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں جاتی۔[3]

---

[1] یہ واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ تمام کتبِ تفسیر میں موجود ہیں۔

[2] شاہ صاحب کا مسلک یہ ہے کہ واقعۂ مسخ صحیح نہیں ہے۔ [3] موضح القرآن سورۂ مائدہ۔

اس سلسلہ میں حضرت عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) نے موعظت و بصیرت سے متعلق بہت خوب بات ارشاد فرمائی ہے :-

"عیسیٰ (علیہ السلام) سے ان کی قوم نے نزولِ مائدہ کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جواب ملا "تمہاری درخواست اس شرط کے ساتھ منظور کی جاتی ہے کہ نہ اس میں خیانت کرنا نہ اُس کو چھپائے رکھنا اور نہ اس کو ذخیرہ کرنا ورنہ یہ بند کر دیا جائے گا اور تم کو ایسا عبرت ناک عذاب دوں گا جو کسی کو نہ دیا جائے گا"

اے معشرِ عرب! تم اپنی حالت پر غور کرو کہ اونٹوں اور بکریوں کی دُم پکڑ کر جنگلوں میں چراتے پھرتے تھے، پھر خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے درمیان ہی سے ایک برگزیدہ رسول مبعوث فرمایا جس کے حسب و نسب سے تم اچھی طرح واقف ہو، اس نے تم کو یہ خبر دی کہ عنقریب تم عجم پر غالب آجاؤ گے اور اس پر چھا جاؤ گے۔ اور اس نے تم کو سختی کے ساتھ منع فرمایا کہ مال و دولت کی فراوانی دیکھ کر ہرگز تم چاندی اور سونے کے خزانے جمع نہ کرنا مگر قسم بخدا کہ زیادہ لیل و نہار نہ گذریں گے کہ تم ضرور سونے چاندی کے خزانے جمع کرو گے اور اس طرح خدائے برتر کے دردناک عذاب کے مستحق بنو گے"[1]

"رفع الی السماء" یعنی زندہ آسمان پر اٹھا لیا جانا

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے نہ شادی کی اور نہ بود و ماند کے لیے گھر بنایا وہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں خدا کا پیغام سناتے اور دینِ حق کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے اور جہاں بھی رات آپہنچتی وہیں کسی سر و سامانِ راحت کے بغیر شب بسر کر دیتے تھے اور چونکہ ان کی ذاتِ اقدس سے مخلوقِ خدا جسمانی و روحانی دونوں طرح کی شفا اور تسکین پاتی تھی اس لیے جس جانب بھی ان کا گذر ہو جاتا خلقت کا انبوہ حسنِ عقیدت کے ساتھ جمع ہو جاتا اور والہانہ محبت کے ساتھ ان پر نثار ہو جانے کو تیار رہتا تھا۔

یہود کو اس دعوتِ حق کے ساتھ جو بغض و عناد تھا اس نے اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو انتہائی حسد اور سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور جب ان کے مسخ شدہ قلوب کسی طرح اس کو

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۱۸۰۔

برداشت نہ کر سکے تو اُن کے سرداروں، فقیہوں، فریسیوں اور صدوقیوں نے ذاتِ اقدس کے خلاف سازش شروع کی اور طے یہ پایا کہ اس ہستی کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کی بجز اس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ بادشاہِ وقت کو مشتعل کر کے اس کو دار پر چڑھا دیا جائے

گذشتہ چند صدیوں سے یہود کے ناگفتہ بہ حالات کی بدولت اس زمانہ میں یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی حکومت اپنے باپ دادا کے علاقہ میں سے بمشکل ایک چوتھائی پر قائم تھی اور وہ بھی برائے نام اور اصل حکومت و اقتدار وقت کے بُت پرست شاہنشاہ قیصرِ روم کو حاصل تھا اور اس کی نیابت میں پلاطیس یہودیہ کے اکثر علاقہ کا گورنر یا بادشاہ تھا۔

یہود اگرچہ اس بُت پرست بادشاہ کے اقتدار کو اپنی بدبختی سمجھ کر اس سے متنفر تھے مگر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے خلاف قلوب میں مشتعل حسد کی آگ نے اور صدیوں کی غلامی سے پیدا شدہ پست ذہنیت نے ایسا اندھا کر دیا کہ انجام اور نتیجہ کی فکر سے بے پرواہ ہو کر پلاطیس کے دربار میں جا پہنچے اور عرض کیا: "عالی جاہ! یہ شخص نہ صرف ہمارے لیے بلکہ حکومت کے لیے بھی خطرہ بنتا جا رہا ہے اگر فوراً ہی اس کا استیصال نہ کر دیا گیا تو نہ ہمارا دین ہی صحیح حالت میں باقی رہ سکے گا اور اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار بھی نہ چلا جائے اس لیے کہ اس شخص نے عجیب و غریب شعبدے دکھا کر خلقت کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ہر وقت اس گھات میں لگا ہے کہ عوام کی اس طاقت کے بل پر قیصر اور آپ کو شکست دے کر خود بنی اسرائیل کا بادشاہ بن جائے۔ اس شخص نے لوگوں کو صرف دُنیوی راہ سے ہی گمراہ نہیں کیا بلکہ اس نے ہمارے دین تک کو بھی بدل ڈالا اور لوگوں کو بددین بنانے میں منہمک ہے۔ پس اس فتنہ کا انسداد ازبس ضروری ہے تاکہ بڑھتا ہوا یہ فتنہ ابتدائی منزل ہی میں کچل ڈالا جائے"۔

غرض کافی گفت و شنید کے بعد پلاطیس نے ان کو اجازت دیدی کہ وہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کو گرفتار کر لیں اور شاہی دربار میں مجرم کی حیثیت سے پیش کریں۔ بنی اسرائیل کے سردار، فقیہ اور کاہن یہ فرمان حاصل کر کے بیحد مسرور ہوئے اور فخر و مباہات کے ساتھ

ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ آخر ہماری سازش کارگر ہوئی اور ہماری تدبیر کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خاص موقع کا منتظر رہا جائے اور کسی خلوت اور تنہائی کے موقع پر اس طرح اس کو گرفتار کیا جائے کہ عوام میں ہیجان نہ ہونے پائے۔ انجیل یوحنا میں اس واقعہ سے متعلق یہ کہا گیا ہے:-

پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کر کے کہا ہم کرتے کیا ہیں؟ یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے اگر ہم اسے یونہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے اور رومی آکر ہماری جگہ اور قوم دونوں پر قبضہ کر لیں گے اور ان میں سے کائفا نام ایک شخص نے جو اس سال سردار کاہن تھا ان سے کہا تم نہیں جانتے اور نہ سوچتے ہو کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک آدمی اُمت کے واسطے مرے نہ کہ ساری قوم ہلاک ہو۔[1]

یہ اس مشورہ کا تذکرہ ہے جو بادشاہ کے پاس جانے سے قبل آپس میں ہوا اور یہ خطرہ ظاہر کیا گیا کہ اگر اس ہستی کو یونہی چھوڑ دیا گیا تو بادشاہِ وقت (قیصر) کہیں سلطنت کے لیے خطرہ سمجھ کر رہی سہی برائے نام حکومتِ یہود کا بھی خاتمہ نہ کر دے۔

اور مرقس کی انجیل میں ہے:-

دو دن کے بعد فصح اور عید الفطر ہونے والی تھی اور سردار کاہن اور فقیہ موقع ڈھونڈھ رہے تھے کہ اسے کیونکر فریب سے پکڑ کر قتل کریں کیونکہ کہتے تھے کہ عید کو کہیں ایسا نہ ہو کہ بلوہ ہو جائے۔[2]

دوسری جانب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے حواریوں کے مکالمہ کو سورۂ آلِ عمران اور سورۂ صف کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے جب یہود کے کفر و انکار اور معاندانہ ریشہ دوانیوں کو محسوس کیا تو ایک جگہ اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں اور کاہنوں کی معاندانہ سرگرمیاں تم سے پوشیدہ نہیں ہیں، اب وقت کی نزاکت اور کڑی آزمائش و امتحان کی گھڑی کی قربت تقاضا کرتی ہے کہ میں تم سے

[1] باب ۱۱ آیات ۴۷ تا ۵۱ [illegible] ۱۳ آیات ۲-۱۔

سوال کروں کہ تم میں کون وہ افراد ہیں جو اس کفر و انکار کے سیلاب کے سامنے سینہ سپر ہو کر خدا کے دین کے ناصر و مددگار بنیں گے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا یہ ارشادِ مبارک سن کر سب نے بڑے جوش و خروش اور صداقتِ ایمانی کے ساتھ جواب دیا ہم ہیں اللہ کے مددگار خدائے واحد کے پرستار، آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلم وفا شعار ہیں، اور درگاہِ باری میں اپنی اس اطاعت کوشی پر استقامت کے لیے یوں دست بدعا ہیں، اے پروردگار! ہم تیری اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لے آئے اور صدق دل کے ساتھ تیرے پیغمبر کے پیرو ہیں، خدایا! تو ہم کو صداقت و حقانیت کے فداکاروں کی فہرست میں لکھ لے۔"

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے فریضۂ دعوت و تبلیغ کے خلاف یہود بنی اسرائیل کی مخالفانہ سرگرمیوں سے متعلق حالات کا یہ حصہ تو اکثر و بیشتر ایسا ہے کہ قرآن اور انجیل کے درمیان اصولاً اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس کے مابعد کے پورے حصۂ بیان میں دونوں کی قطعاً جدا جدا راہیں ہیں اور ان کے درمیان اس درجہ تضاد ہے کہ کسی طرح بھی ایک کو دوسری راہ کے قریب نہیں لایا جا سکتا۔ البتہ اس جگہ پہنچ کر یہود اور نصاریٰ دونوں کا باہمی اتحاد ہو جاتا ہے اور دونوں کے بیانات واقعہ سے متعلق ایک ہی عقیدہ پیش کرتے ہیں، فرق ہے تو یہ کہ یہود اس واقعہ کو اپنا کارنامہ اور اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں اور نصاریٰ اس کو یہود بنی اسرائیل کی ایک قابلِ لعنت جدوجہد یقین کرتے ہیں۔

یہود اور نصاریٰ دونوں کا مشترک بیان یہ ہے کہ یہود کے سرداروں اور کاہنوں کو یہ اطلاع ملی کہ اس وقت یسوع (علیہ السلام) لوگوں کی بھیڑ سے الگ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک بند مکان میں موجود ہیں، یہ موقع بہترین ہے، اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجیے، فوراً ہی یہ لوگ موقع پر پہنچ گئے اور چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر کے یسوع (علیہ السلام) کو گرفتار کر لیا اور توہین و تذلیل کرتے ہوئے پیلاطیس کے دربار میں لے گئے تاکہ وہ انکو سولی پر لٹکائے اور اگرچہ پیلاطیس نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو بے قصور سمجھ کر چھوڑ دینا چاہا مگر

بنی اسرائیل کے اشتعال پر مجبوراً سپاہیوں کے حوالہ کر دیا۔ سپاہیوں نے ان کو کانٹوں کا تاج پہنایا، مُنہ پر تھوکا، کوڑے لگائے اور ہر طرح کی توہین و تذلیل کرنے کے بعد مجرموں کی طرح سولی پر لٹکا دیا اور دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونک دیں، سینہ کو برچھی کی انی سے چھید دیا اور اس کس مپرسی کی حالت میں انھوں نے یہ کہتے ہوئے جان دیدی "ایلی ایلی لما سبقتنی" انجیل متی میں اس واقعہ کی تفصیلات کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

سردار کاہن نے اُس سے کہا: میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہے تو ہم سے کہدے۔ یسوع نے اس سے کہا: تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابنِ آدم کو قادرِ مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتا دیکھو گے اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر بکا ہے اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی، دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سُنا ہے تمہاری کیا رائے ہے، انھوں نے جواب میں کہا وہ قتل کے لائق ہے اس پر انھوں نے اس کے مُنہ پر تھوکا اور اس کے مکّے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا..... جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اُسے مار ڈالیں اور اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطس حاکم کے حوالہ کیا..... اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں (بنی اسرائیل) کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا اس وقت برابا نام ان کا ایک مشہور قیدی تھا پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطیس نے ان سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر چھوڑ دوں؟ برابا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے؟..... وہ بولے برابا کو پیلاطس نے ان سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے کیا کروں سب نے کہا اس کو صلیب دیجائے اس نے کہا کیوں؟ اس نے کیا بُرائی کی ہے؟ مگر وہ اور بھی چلا چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دی جائے، جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا اُلٹا بلوہ ہوتا جاتا ہے

تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا "میں اس راست باز کے خون سے بری ہوں تم جانو" سب لوگوں نے جواب دیکر کہا "کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر" اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالے کیا تاکہ صلیب دی جائے۔ اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لیجا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک اُسے ٹھٹھوں میں اُڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ آداب۔ اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چوغے کو اس پر سے اتار کر پھر اس کے کپڑے اُسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے۔ اس وقت اس کے ساتھ دو ڈاکو صلیب پر چڑھائے گئے ایک داہنے اور ایک بائیں اور راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر اس کو لعن طعن کرتے اور کہتے تھے اے مقدس کے ڈھانے والے اور تین دن میں بنانے والے اپنے تئیں بچا اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اُتر آ، اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کے ٹھٹھے کے ساتھ کہتے تھے اس نے اوروں کو بچایا اپنے تئیں نہیں بچا سکتا... اور دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا: "ایلی ایلی لما سبقتنی" (اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھ کو کیوں چھوڑ دیا) جو وہاں کھڑے تھے اُن میں سے بعض نے سُن کر کہا "یہ ایلیا کو پکارتا ہے..... یسوع پھر بڑی آواز سے چلایا اور جان دیدی۔"[1]

تفصیلات میں کم و بیش فرق کے ساتھ یہی مفروضہ داستان باقی تینوں انجیلوں میں بھی مذکور ہے۔ چاروں انجیلوں کی اس متفقہ مگر مفروضہ داستان کو مطالعہ کرنے کے بعد طبیعت پر قدرتی اثر یہ پڑتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی موت انتہائی بیکسی اور بے بسی

[1] باب ۲۶ آیات ۵۰ تا ۵۷۔

کی حالت میں دردناک طریقہ سے ہوئی اور اگرچہ خدا کے پاک اور مقدس بندوں کے لیے یہ کوئی اجنبی بات نہ تھی بلکہ مقربینِ بارگاہِ صمدی کے لیے اس قسم کی کڑی آزمائشوں کا مظاہرہ اکثر ہوتا رہا ہے لیکن اس واقعہ کا یہ پہلو اس کے مفروضہ اور گھڑے ہوئے ہونے پر روزِ روشن کی طرح شاہد ہے کہ حضرت یسوع نے ایک اولوالعزم پیغمبر بلکہ مردِ صالح کی طرح اس واقعہ کو صبر و رضاءِ الٰہی کے ساتھ انگیز نہیں کیا بلکہ ایک انتہائی مایوس انسان کی طرح خدا سے شکوہ کرتے کرتے جان دیدی "ایلی ایلی، لما سبقتنی" کہتے ہوئے جان دے دینا مایوسی اور شکوہ کی وہ صورتِ حال ہے جو کسی طرح بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کے شایانِ شان نہیں کہی جاسکتی، پھر اس واقعہ کا یہ پہلو بھی کم حیرت زا نہیں ہے کہ بقول انجیل کے یسوع مسیح نے اس حادثہ سے قبل تین مرتبہ خدائے تعالیٰ سے یہ درخواست کی "اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ (موت کا) پیالہ مجھ سے ٹل جائے" اور جب یہ درخواست کسی طرح قبول نہ ہوئی تو مایوس ہو کر کہنا پڑا "اگر یہ میرے پیے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو"

باعثِ حیرت یہ بات ہے کہ جبکہ عقیدۂ "کفارہ" کے مطابق حضرت مسیح کا یہ معاملہ خدا اور اس کے بیٹے (العیاذ باللہ) کے درمیان طے شدہ تھا تو پھر اس درخواست کے کیا معنی اور مگر لوازمِ بشریت کی بناء پر تھا تو خدا کی مرضی معلوم ہو جانے اور اس پر قناعت کر لینے کے بعد پھر یہ بے صبر اور مایوس انسانوں کی طرح جان دینے کا کیا سبب؟

یہود کی گھڑی ہوئی اس داستان کو چونکہ نصاریٰ نے قبول کر لیا تو یہود از رہِ فخر و غرور اس پر بیحد مسرور ہیں اور کہتے ہیں کہ مسیح ناصری اگر "مسیح موعود" ہوتا تو خدائے تعالیٰ اس بے بسی اور بے کسی کے ساتھ اس کو ہمارے ہاتھ میں نہ دیتا کہ وہ مرتے وقت تک خدا سے شکوہ کرتا رہا کہ اس کو بچائے مگر خدا نے اس کی کوئی مدد نہ کی حالانکہ ہمارے باپ دادا اس وقت بھی کافی اشتعال دیتے رہے کہ اگر تو حقیقۃً خدا کا بیٹا اور "مسیح موعود" ہے تو کیوں تجھ کو خدا نے ہمارے ہاتھوں اس ذلت سے نہ بچا لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ نصاریٰ کے پاس جبکہ اس چبھتے ہوئے الزام کا کوئی جواب نہیں تھا اور واقعہ کی ان تفصیلات کو مان لینے کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی کوئی قیمت باقی نہیں رہ جاتی تھی تب انھوں نے واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد ایک پارۂ بیان کا اور اضافہ کیا۔ یوحنا کی انجیل میں ہے:-

لیکن جب انھوں نے یسوع کے پاس آکر دیکھا کہ وہ مرچکا ہے تو اس کی ٹانگیں نہ توڑیں مگر ان میں سے ایک سپاہی نے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اُس سے خون اور پانی بہ نکلا..... ان باتوں کے بعد ارمیتہ کے رہنے والے یوسف نے جو یسوع کا شاگرد تھا یہودیوں کے خوف سے خفیہ طور پر پیلاطیس سے اجازت چاہی کہ یسوع کی لاش لیجائے، پیلاطیس نے اجازت دیدی پس وہ آکر اس کی لاش لے گیا اور نیکدیمس بھی آیا جو پہلے یسوع کے پاس رات کو گیا تھا اور پچاس سیر کے قریب مر اور عود ملا ہوا لایا۔ پس انھوں نے یسوع کی لاش لے کر اُسے سوتی کپڑے میں خوشبودار چیزوں کے ساتھ کفنایا جس طرح کہ یہودیوں میں دفن کرنے کا دستور ہے اور جس جگہ اُسے صلیب دی گئی وہاں ایک باغ تھا اور اس باغ میں ایک نئی قبر تھی جس میں کبھی کوئی نہ رکھا گیا تھا پس انھوں نے یہودیوں کی تیاری کے دن کے باعث یسوع کو وہیں رکھ دیا۔ ہفتہ کے پہلے دن مریم مگدلینی ایسے تڑکے کہ ابھی اندھیرا ہی تھا قبر پر آئی اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا پس وہ شمعون پطرس اور اس کے دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوع عزیز رکھتا تھا دوڑی ہوئی گئی اور ان سے کہا کہ خداوند کو قبر سے نکال لے گئے اور ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھ دیا..... لیکن مریم باہر قبر کے پاس کھڑی روتی ہی اور جب روتے روتے قبر کی طرف جھک کے اندر نظر کی تو دو فرشتوں کو سپید پوشاک پہنے ہوئے ایک کو سرہانے اور دوسرے کو پائینتی بیٹھے دیکھا جہاں یسوع کی لاش پڑی تھی انھوں نے اس سے کہا اے عورت تو کیوں روتی ہے، اُس نے اُن سے کہا اِس لیے کہ

میرے خداوند کو اٹھالے گئے اور معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھا یہ کہہ کر وہ پیچھے پھری اور یسوع کو کھڑے دیکھا اور نہ پہچانا کہ یہ یسوع ہے۔ یسوع نے اس سے کہا مریم! وہ پھر اُس سے عبرانی زبان میں بولی "ربونی" یعنی اے استاد! یسوع نے اس سے کہا مجھے نہ چھو کیونکہ میں اب تک باپ کے پاس اوپر نہیں گیا لیکن میرے بھائیوں کے پاس جاکر ان سے کہو کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ کے اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں، مریم مگدلینی نے آکر شاگردوں کو خبر دی کہ میں نے خداوند کو دیکھا اور اس نے مجھ سے یہ باتیں کہیں۔ پھر اُسی دن جو ہفتہ کا پہلا دن تھا شام کے وقت جب وہاں کے دروازے جہاں شاگرد تھے یہودیوں کے ڈر سے بند تھے یسوع آکر بیچ میں کھڑا ہوا اور ان سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو اور یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ اور پسلی انھیں دکھائی، پس شاگرد خداوند کو دیکھ کر خوش ہوئے یسوع نے پھر اُن سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے اسی طرح میں بھی تمہیں بھیجتا ہوں اور یہ کہہ کر اُنکو پھونکا اور ان سے کہا "روح القدس" لو۔[1]

ہر ایک شخص معمولی غور و فکر کے بعد بہ سہولت سمجھ سکتا ہے کہ یہ پارۂ بیان پہلے حصۂ بیان کے ساتھ غیر مربوط اور قطعاً بے جوڑ ہے بلکہ یہ اندازہ لگانا ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں تفصیلات ایک ہی شخص سے وابستہ ہیں کیونکہ پہلا پارۂ بیان ایک ایسی شخصیت کا مرقع ہے جو بے بس و بیکس مایوس اور خدا سے شاکی نظر آتی ہے اور دوسرا حصۂ بیان ایسی ہستی کا رُخِ روشن پیش کرتی ہے جو خدائی صفات سے متصف، ذاتِ باری کی مقرب اور پیش آمدہ واقعات سے مطمئن و مسرور ہے بلکہ ان کے وقوع کی متمنی اور ان کو اپنے ادائے فرض کا اہم جزو سمجھتی ہے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

بہر حال حقیقت چونکہ دوسری تھی اور ایک عرصۂ دراز کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی بدعت نے

[1] انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۴-۳۳ و آیت ۴۲-۳۸ و باب ۲۰ آیات ۱ تا ۲۲۔

نصاریٰ کو اس کے خلاف اس گڑھے ہوئے افسانہ کی تصنیف پر مجبور کر دیا اس لیے قرآن عزیز نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) سے متعلق دوسرے گوشوں کی طرح اس گوشہ سے بھی جہالت و تاریکی کا پردہ ہٹا کر حقیقتِ حال کے رُخِ روشن کو جلوہ آرا کرنا ضروری سمجھا اور اس نے اپنا وہ فرض انجام دیا جس کو مذاہبِ عالم کی تاریخ میں قرآن کی دعوتِ تجدید و اصلاح کہا جاتا ہے۔

اس نے بتایا کہ جس زمانہ میں بنی اسرائیل، پیغمبرِ حق اور رسولِ خدا (عیسیٰ بن مریمؑ) کے خلاف خفیہ تدبیروں اور سازشوں میں مصروف اور ان پر نازاں تھے اسی زمانہ میں خدائے برتر کے قانونِ قضاء و قدر نے یہ فیصلہ نافذ کر دیا کہ کوئی طاقت اور مخالف قوت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) پر قابو نہیں پا سکتی اور ہماری محکم تدبیر اس کو دشمنوں کے ہر مکر سے محفوظ رکھے گی اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب بنی اسرائیل نے اُن پر نرغہ کیا تو اُن کو پیغمبر خدا پر کسی طرح دسترس حاصل نہ ہو سکی اور ان کو بحفاظت تمام اٹھا لیا گیا اور جب بنی اسرائیل مکان میں گھسے تو صورتِ حال اُن پر مشتبہ ہو گئی اور وہ ذلت اور رسوائی کے ساتھ اپنے مقصد میں ناکام رہے اور اس طرح خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا جو عیسیٰ بن مریمؑ کی حفاظت کے لیے کیا گیا تھا۔

تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ جب عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہ محسوس فرمایا کہ اب بنی اسرائیل کے کفر و انکار کی سرگرمیاں اس درجہ بڑھ گئی ہیں کہ وہ میری توہین و تذلیل بلکہ قتل کے لیے سرگرم سازش ہیں تو انھوں نے خاص طور سے ایک مکان میں اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے صورتِ حال کا نقشہ پیش فرما کر ارشاد فرمایا: امتحان کی گھڑی سر پر ہے، کڑی آزمائش کا وقت ہے، حق کو مٹانے کی سازشیں پورے شباب پر ہیں، اب میں تمہارے درمیان زیادہ نہیں رہوں گا اس لیے میرے بعد دینِ حق پر استقامت، اس کی نشر و اشاعت اور یاری و نصرت کا معاملہ صرف تمہارے ساتھ وابستہ ہو جانے والا ہے،

اِس لیے مجھے بتاؤ کہ خدا کی راہ میں سچا مددگار کون کون ہے۔ حواریوں نے یہ کلامِ حق سُن کر کہا: "ہم سب ہی خدا کے دین کے مددگار ہیں، ہم سچے دل سے خدا پر ایمان لائے ہیں اور اپنی صداقتِ ایمانی کا آپ ہی کو گواہ بناتے ہیں اور یہ کہنے کے بعد انسانی کمزوریوں کے پیشِ نظر اپنے دعوی پر ہی بات ختم نہیں کر دی بلکہ درگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہو گئے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں تو اس پر ہم کو استقامت عطا فرما اور ہم کو اپنے دین کے مددگاروں کی فہرست میں لکھ لے۔

اِس جانب سے مطمئن ہو کر اب حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) اپنے فریضۂ دعوت وارشاد کے ساتھ ساتھ منتظر رہے کہ دیکھیے معاندین کی سرگرمیاں کیا رُخ اختیار کرتی ہیں اور خدائے برحق کا فیصلہ کیا صادر ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں قرآن عزیز کے ذریعہ یہود و نصاریٰ کے ظنون واوہام فاسدہ کے خلاف "علم ویقین کی روشنی" بخشتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ جس وقت معاندین اپنی خفیہ تدبیروں میں سرگرمِ عمل تھے اسی وقت ہم نے بھی اپنی قدرتِ کاملہ کی مخفی تدبیر کے ذریعہ یہ فیصلہ کر لیا کہ عیسیٰ بن مریمؑ کے متعلق معاندینِ حق کی تدبیر کا کوئی گوشہ بھی کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی پوشیدہ تدابیر کے مقابلہ میں کسی کی پیش نہیں جا سکے گی اس لیے کہ اُس کی تدبیر سے بہتر کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ	اور انھوں نے (یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف)
وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝	خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے (یہود کے مکر کے خلاف) خفیہ
(آلِ عمران پ ۳ ع ۳)	تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کا مالک ہے۔

لغتِ عرب میں "مکر" کے معنی خفیہ تدبیر (اور دھوکا کرنے) کے ہیں اور علمِ معانی کے قاعدہ "مشاکلہ" کے مطابق جب کوئی شخص کسی کے جواب یا دفاع (Defence) میں خفیہ تدبیر کرتا ہے تو وہ اخلاق اور مذہب کی نگاہ میں کتنی ہی عمدہ تدبیر کیوں نہ ہو اس کو بھی

"مکر" ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ ہر ایک زبان کے محاورہ میں بولا جاتا ہے "برائی کا بدلہ برائی ہے" حالانکہ ہر شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ برائی کرنے والے کے جواب میں اسی قدر مقابلہ کا جواب دینا اخلاق اور مذہب دونوں کی نگاہ میں "برائی" نہیں ہے تاہم تعبیر میں دونوں کو ہم شکل ظاہر کر دیا جاتا ہے اور اسی کو "مشاکلہ" کہتے ہیں اور یہ فصاحت و بلاغت کا اہم جزو سمجھا جاتا ہے۔

غرض خفیہ تدبیر دونوں جانب سے تھی ایک جانب بُرے بندوں کی بُری تدبیر اور دوسری جانب خدائے برتر کی بہترین تدبیر، نیز ایک جانب قادرِ مُطلق کی تدبیر کامل تھی جس میں نقص و خامی کا امکان نہیں اور دوسری جانب دھوکے اور فریب کی خام کاریاں تھیں جو تارِ عنکبوت ہو کر رہ گئیں۔

آخر وہ وقت آپہونچا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں، کاہنوں، اور فقیہوں نے حضرتِ عیسٰی علیہ السّلام کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا، ذاتِ اقدس اور حواری مکان کے اندر بند ہیں اور دشمن چاروں طرف سے محاصرہ کیے ہوئے ہیں لہٰذا اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ کیا صورت ہو کہ جس سے دشمن ناکام رہے اور حضرتِ عیسٰی علیہ السّلام کو کسی طرح کا بھی گزند نہ پہنچا سکے تاکہ خدائے قادر کا وعدۂ حفاظت اور دعوئ تدبیرِ خیر پورا ہو تو اس کے متعلق قرآن نے بتایا کہ بیشک خدا کا وعدہ پورا ہوا اور اُس کی تدبیرِ محکم نے عیسٰی (علیہ السّلام) کو دشمنوں کے ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رکھا اور صورت یہ پیش آئی کہ اِس نازک گھڑی میں حضرتِ عیسٰی (علیہ السّلام) کو وحی الٰہی نے یہ بشارت سُنائی "عیسٰی! خوف نہ کر تیری مدت پوری کی جائے گی (یعنی تم کو دشمن قتل نہیں کر سکیں گے اور نہ تم اس وقت موت سے دوچار ہوگے) اور ہوگا یہ کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاءِ اعلیٰ کی جانب) اٹھالوں گا اور اِن کافروں سے ہر طرح تجھ کو پاک رکھوں گا (یعنی یہ تجھ پر کسی قسم کا قابو نہ پا سکیں گے) اور تیرے پیروؤں کو اِن کافروں پر ہمیشہ غالب رکھوں گا (یعنی بنی اسرائیل کے مقابلہ میں

قیامت تک عیسائی اور مسلمان غالب رہیں گے اور ان کو کبھی ان دونوں پر حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہوگا، پھر انجام کار میری جانب (موت کے بعد) لوٹ آنا ہے پس میں ان باتوں پر فیصلۂ حق دوں گا جن کے متعلق تم آپس میں اختلاف کر رہے ہو :-

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ	(وہ وقت ذکر کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰؑ
مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ	سے کہا "اے عیسیٰ! بے شبہ میں تیری مدت کو پوری کرونگا
مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ	اور تجھ کو اپنی جانب اٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو کافروں
اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى	(بنی اسرائیل) سے پاک رکھنے والا ہوں اور جو تیری پیروی
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ	کریں گے ان کو تیرے منکروں پر قیامت تک کے لیے غالب
فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ	رکھنے والا ہوں، پھر میری جانب ہی لوٹنا ہے، پھر میں اُن
تَخْتَلِفُوْنَ (آلِ عمران پ ۳ ع ۶)	باتوں کا فیصلہ کروں گا جن کے بارے میں (آج) تم جھگڑ رہے ہو۔
وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	(قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو اپنے احسانات شمار
عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ	کراتے ہوئے فرمائے گا) اور وہ وقت یاد کرو جب میں نے بنی اسرائیل
فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ	کو تجھ سے روک دیا (یعنی وہ کسی طرح تجھ پر قابو نہ پا سکے) جبکہ تو
اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ	ان کے پاس معجزات لے کر آیا اور ان میں سے کافروں نے
(مائدہ پ ۷ ع ۶)	کہہ دیا: "یہ تو جادو کے ماسوا اور کچھ نہیں ہے۔"

تو اب جبکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ اطمینان دلا دیا گیا کہ اس سخت محاصرہ کے باوجود دشمن تم کو قتل نہ کر سکیں گے اور تم کو غیبی ہاتھ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اُٹھا لے گا اور اس طرح دشمنانِ دین کے ناپاک ہاتھوں سے آپ ہر طرح محفوظ کر دیے جائیں گے تو اس جگہ پہنچکر ایک دوسرا سوال پیدا ہوا کہ یہ کس طرح ہوا اور واقعہ نے کیا صورت اختیار کر لی؟ کیونکہ یہود و نصاریٰ تو کہتے ہیں کہ مسیح کو سولی پر بھی لٹکایا اور مار بھی ڈالا تب قرآن نے بتایا کہ مسیح بن مریم (علیہما السلام) کے قتل و صلیب کی پوری داستان سرتاسر غلط اور جھوٹ ہے بلکہ

اصل معاملہ یہ ہے کہ جب مسیحؑ کو بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھالیا گیا اور اس کے بعد دشمن مکان کے اندر گھس پڑے تو اُن پر صورتِ حال مشتبہ کردی گئی اور وہ کسی طرح نہ جان سکے کہ آخر اِس مکان میں سے مسیح (علیہ السلام) کہاں چلا گیا :-

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ	اور (یہود ملعون قرار دیے گئے) اپنے اس قول پر کہ ہم نے
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ	مسیح عیسیٰ بن مریم پیغمبرِ خدا کو قتل کر دیا حالانکہ انھوں نے نہ اسکو
وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ	قتل کیا اور نہ سُولی پر چڑھایا بلکہ (خدا کی خفیہ تدبیر کی بدولت)
شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ	اصل معاملہ ان پر مشتبہ ہو کر رہ گیا اور جو لوگ اس کے قتل
اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ	کے بارہ میں جھگڑ رہے ہیں بلاشبہ وہ اس (عیسیٰؑ) کی
مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ	جانب سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس حقیقتِ
اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ	حال کے بارہ میں ظن (اٹکل) کی پیروی کے سوا علم کی
يَقِيْنًا ۞ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ	روشنی نہیں ہے اور انھوں نے عیسیٰؑ کو یقیناً قتل نہیں کیا
وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۞	بلکہ ان کو اللہ نے اپنی جانب (ملاءِ اعلیٰ کی جانب) اٹھالیا
(نساء پ ع)	اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

قرآنِ عزیز کا یہ وہ بیان ہے جو یہود و نصاریٰ کے اختراعی فسانہ کے خلاف اس نے حضرتِ مسیح بن مریم (علیہما السلام) کے متعلق دیا ہے اب دونوں بیانات آپ کے سامنے ہیں، اور عدل و انصاف کا ترازو آپ کے ہاتھ میں۔ پہلے حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی شخصیت اور ان کے دعوت و ارشاد کے مشن کو تاریخی حقائق کی روشنی میں معلوم کیجیے اور اس کے بعد ایک مرتبہ پھر اُن تفصیلی واقعات پر نظر ڈالیے جو ایک اولوالعزم پیغمبر، مقربِ بارگاہِ الٰہی اور نصاریٰ کے عقیدۂ باطل کے مُطابق خدا کے بیٹے کو خدا کے فیصلہ کے سامنے مایوس، مضطرب، بے یار و مددگار اور خدا سے شاکی ظاہر کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس تضادِ بیان پر بھی غور فرمائیے کہ ایک جانب عقیدۂ کفارہ کی بنیاد صرف اس پر قائم ہے کہ حضرتِ مسیحؑ خدا کا بیٹا بن کر آیا ہی

اِس غرض سے تھا کہ مصلوب ہوکر دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہوجائے اور دوسری جانب صلیب اور قتلِ مسیح کی داستان اِس اساس پر کھڑی کی گئی ہے کہ جب وہ وقتِ موعود آپہنچا ہے تو خدا کا یہ فرضی بیٹا اپنی حقیقت اور دنیا میں وجود پذیری کو یکسر فراموش کرکے "ایلی ایلی لما سبقتنی" کا حسرتناک جملہ زبان سے کہتا اور مرضیِ الٰہی پر اپنی ناخوشی کا اظہار کرتا ہوا نظر آیا ہے کیا کسی شخص کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے کہ اگر نصاریٰ کے بیان کردہ واقعات کے دونوں حصے صحیح اور درست ہیں تو اِن دونوں کے باہم یہ تضاد کیسا اور اس عدم مطابقت کے کیا معنی؟

پس اگر ایک حقیقت بیں اور دُور رس نگاہ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اور واقعات وحالات کی ان تمام کڑیوں کو باہم جوڑ کر اس مسئلہ کا مُطالعہ کرے تو وہ تصدیقِ حق کے پیشِ نظر بلا تامل یہ فیصلہ کرے گی کہ بائبل کی یہ داستان تضاد کی حامل اور گڑھی ہوئی داستان ہے اور قرآن نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ دیا ہے وہی حق اور مبنی بر صداقت ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے بعد سے سینٹ پال سے قبل تک نصاریٰ یہود کی اس خرافی داستان سے قطعاً بے تعلق تھے لیکن جب سینٹ پال (پولوس رسول) نے تثلیث اور کفارہ پر جدید عیسائیت کی بنیاد رکھی تو کفارہ کے عقیدہ کی استواری کیلیے یہود کی اس خرافی داستان کو بھی مذہب کا جزو بنا لیا گیا۔

لیکن واقعہ سے متعلق حد درجہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب کہ چودہ صدیوں سے قرآنِ حکیم نے عیسیٰ (علیہ السلام) کی عظمت وجلالتِ قدر کا اعلان کرتے ہوئے اُن کے "رفع الی السماء" کی حقیقت کو یہود ونصاریٰ کی خرافی داستان کے خلاف علم ویقین کی روشنی میں نمایاں اور یہود ونصاریٰ کو دلائل وبراہین کے ذریعہ لاجواب اور سرنگوں کر دیا تھا تو اس کے مقابلہ میں آج ایک مُدعی اسلام، دعوئے نبوت ومسیحیت کے شوق یا ہندوستان پر مسلط عیسائی حکومت کی خود غرضانہ خوشامد میں یہود ونصاریٰ کے اسی عقیدہ کو دوبارہ زندہ کرنا اور اس پر اپنے "باطل عقیدۂ نبوت" کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اور پنجاب (قادیان) کا یہ متنبی قرآنِ عزیز کی

تصریحات سے بے نیاز ہو کر نہایت جسارت کے ساتھ اُن تمام واقعات کی تصدیق کرتا ہے جو اس سلسلہ میں یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے باطل مزعومہ عقائد کی تکمیل کے لیے اختراع کیے ہیں، وہ کہتا ہے کہ بلاشبہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہود نے اسیر کیا، اُن کا ٹھٹھا اُڑایا، ان کے مُنہ پر تھوکا، اُن کے طمانچے بھی لگائے، ان کو کانٹوں کا تاج بھی پہنایا اور ان کے علاوہ ہر قسم کی توہین و تذلیل کا سلوک کرنے کے بعد اُن کو صلیب پر بھی چڑھایا اور اپنے زعم میں اُن کو قتل بھی کر ڈالا البتہ یہود و نصاریٰ کی حرف بحرف تصدیق کے بعد بغیر کسی قرآنی نص، حدیثی روایت اور تاریخی شہادت کے اپنی جانب سے یہ اضافہ کرتا ہے کہ جب شاگردوں کے مطالبہ پر نعش ان کے حوالہ کر دی گئی اور وہ تجہیز و تکفین کے لیے آمادہ ہوئے تو دیکھا کہ جسم میں جان باقی ہے تب انھوں نے خفیہ طور پر ایک خاص مرہم کے ذریعہ اُن کے زخموں کا علاج کیا اور جب وہ چنگے ہو گئے تو پوشیدہ رہ کر کشمیر کو چلے گئے اور وہاں بھی حیات کے آخری لمحوں تک خود کو چھپائے رکھا اور گمنامی میں وہیں انتقال پا گئے، گویا یوں کہئے کہ یہود و نصاریٰ کی مفروضہ داستان میں حضرت مسیح (علیہ السلام) سے متعلق توہین و تذلیل کے جس قدر بھی پہلو تھے وہ سب تو متنبیِ کاذب نے قبول کر لیے باقی اُن کی عظمتِ شان اور جلالتِ مرتبہ سے متعلق پہلو کو داستان سے خارج کر کے اس کے ساتھ ایک ایسا فرضی حصہ جوڑ دیا جس سے ایک جانب نیچر پرستوں کو اپنی جانب مائل کرنے کا سامان مہیا ہو سکے اور دوسری جانب عیسیٰ (علیہ السلام) کی باقی زندگی مُبارک کو گمنامی کے ساتھ وابستہ کر کے توہین و تذلیل کا ایک گوشہ جو تشنۂ سامان رہ گیا تھا اس کی تکمیل ہو جائے (اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون)

متنبیِ پنجاب کو یہ سب کچھ کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس کی جانب ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے اور اس کی تفصیل کے لیے پروفیسر برنی کی کتاب "قادیانی مذہب" لائقِ مطالعہ ہے یا خود متنبیِ کاذب کی تصنیفی ہفوات اس حقیقت کو عُریاں کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

ہمارے پیشِ نظر تو یہ مسئلہ ہے کہ متنبیِ پنجاب نے کس طرح قرآن حکیم کی نصوصِ قطعیہ کے

خلاف یہود و نصاریٰ کے عقیدۂ "توہین" "تصلیب" اور قتلِ عیسیٰ علیہ السلام کی تائید پر بے جا جسارت کا اقدام کیا اور جس حد تک اختلاف کیا اس میں بھی دعوٰی قرآنی کے خلاف ان کی حیاتِ طیبہ کو نامراد و ناکام اور گمنام ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی۔

آپ ابھی سُن چکے ہیں کہ قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں خدائے تعالیٰ کی نجات سے دعوئ حفاظت و برتری کو کس قوتِ بیان کے ساتھ نمایاں کیا ہے "وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ" "اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" اور پھر کس زور کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دعوائے حفاظت کو اس شان کے ساتھ پورا کیا کہ دشمن کسی حیثیت سے بھی مسیح بن مریم (علیہما السلام) پر قابو نہ پا سکے اور ہاتھ تک نہ لگا سکے۔ "وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ" "وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ"

تو اب قابلِ غور ہے یہ بات کہ ہم دنیا میں روز و شب یہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ اگر کسی صاحبِ قوت و اقتدار ہستی کے عزیز دوست یا مصاحب کے خلاف ان کا دشمن درپے آزار یا قتل کے درپے ہوتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ ہم صاحبِ اقتدار ہستی کی اعانت کے بغیر دشمن کے مقابلہ میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے وہ صاحبِ اقتدار کی جانب رجوع کرتے ہیں اور یہ ہستی انکو پوری طرح اطمینان دلاتی ہے کہ دشمن ان کو کسی طرح نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ اُن تک اس کی دسترس ہی نہیں ہونے دی جائے گی تو ہر ایک اہلِ عقل اس کا یہی مطلب لیتا ہے کہ اب کسی بھی حالت میں اُن کو دشمن کا خطرہ باقی نہیں رہا مگر یہ کہ صاحبِ اقتدار ہستی اپنے وعدہ کا ایفاء نہ کرے اور جھوٹا ثابت ہو اور یا دشمن کی طاقت اتنی زیادہ ہو کہ وہ خود بھی اس حمایت و نصرت میں مغلوب و مقہور ہو کر رہ جائے۔

پس جب انسانی دنیا میں یہ اطلاع موصول ہو کہ صاحبِ اقتدار ہستی کے عزیز دوست یا مصاحب کو اس کے دشمن نے گرفتار کر لیا، مار پیٹا، مُنہ پر تھوکا اور ہر طرح ذلیل و

رسوا کرکے اپنے گمان میں مار بھی ڈالا اور مُردہ سمجھ کر نعش اس کے عزیزوں کے سپرد کردی مگر حسبِ اتفاق نبض دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کہیں جان اٹکی رہ گئی ہے لہٰذا علاج معالجہ کیا گیا اور وہ روبصحت ہوگیا تو دنیائے انسانی اس صاحبِ اقتدار ہستی کے متعلق کیا رائے قائم کریگی جس نے اس مظلوم کی حمایت و نصرت کا وعدہ کیا تھا؟ یہ کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا یا نہیں کیا؟ ظاہر ہے کہ نہیں کیا خواہ قصداً نہیں کیا یا اس لیے کہ وہ مجبور رہا۔

پس اگر دنیائے انسانی کے معاملات میں صورتِ حال یہ ہے کہ معلوم نہیں کہ مشتی پنجاب کے عقل و دماغ نے قادرِ مطلق خدا کے متعلق کس ذہنیت کے ماتحت یہ فیصلہ کیا کہ خدا نے عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کو ہر قسم کی حفاظت و صیانت کے وعدہ کے باوجود دشمن کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہونے دیا جس کو یہود و نصاریٰ کی اندھی تقلید میں مشتی پنجاب نے تسلیم کرلیا اور اشک شوئی کے لیے صرف اس قدر اضافہ کردیا کہ اگرچہ یہود نے صلیب و قتل کے بعد سمجھ لیا تھا کہ روح قفسِ عنصری سے نکل چکی ہے مگر حقیقۃً ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ رمق جان ابھی غیر محسوس طور پر باقی تھی اس لیے اسی طرح ان کی جان بچ گئی جس طرح موجودہ زمانہ میں اب سے چند سال قبل جیلوں میں پھانسی دینے کا جو طریقہ رائج تھا اس کی وجہ سے کبھی پھانسی پانے کے بعد رمقِ جان باقی رہ جاتی تھی اور نعش کی سپردگی کے بعد علاج معالجہ سے وہ اچھا ہوجاتا تھا۔

بہرحال ہم تو اس ذاتِ واحد قادرِ مطلق خدا پر ایمان رکھتے ہیں جس نے جب کبھی بھی اپنے خاص بندوں (نبیوں اور رسولوں) سے اس قسم کا وعدۂ حفاظت و صیانت کیا ہے تو پھر اس کو پورا بھی ایسی شان سے کیا ہے جو قادرِ مطلق ہستی کے لیے شایاں اور لائق ہے۔

حضرتِ صالح (علیہ السلام) اور ان کی قوم کے منکرینِ حق کا معاملہ سورۂ نمل میں جس معجزانہ شان کے ساتھ بیان ہوا ہے اس پر غور فرمائیے۔ ارشادِ باری ہے:۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ اور شہر میں نو شخص تھے جو (بہت) مُفسد تھے اور کوئی کام

يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا	صلاح کاری کا نہیں کرتے تھے، انھوں نے آپس میں کہا
يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ	"باہم قسمیں کھاؤ کہ ہم ضرور صالحؑ اور اس کے گھر والوں پر
لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ	شبخون ماریں گے اور پھر اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے
لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ	کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت موقع پر موجود ہی
وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ وَمَكَرُوْا	نہیں تھے اور قسم بخدا ہم ضرور سچے ہیں" اور انھوں نے
مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ	(صالحؑ کے خلاف) خفیہ سازش کی اور ہم نے بھی (انکی
لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ	سازش کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور وہ ہماری مخفی تدبیر
كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا	کو نہیں سمجھتے تھے پس (اے محمدؐ!) دیکھو! کہ ان کی خفیہ
دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ	سازشی تدبیر کا کیا حشر ہوا؟ یہ کہ ہم نے ان کو (مفسدوں کو)
فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا	اور ان کی سرکش قوم کو سب کو ہلاک کر دیا (نگاہ اٹھا کر)
ظَلَمُوْا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ	دیکھو یہ (قریب ہی) ہیں ان کے گھروں کے کھنڈر ویران
لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَ	ہیں ان کے ظلم کی وجہ سے، بیشک اس واقعہ میں نشانی
اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا	ہے سمجھ والوں کے لیے اور ہم نے نجات دی ایمان والوں
يَتَّقُوْنَ ۝ (نمل پ ۱۹ ع ۴)	کو جو کہ پرہیزگار تھے۔

اور پھر مطالعہ کیجیے اُس عظیم الشان واقعہ کا جو ہجرتِ خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تعلق رکھتا ہے اور سورۂ انفال میں دشمنانِ حق کی ذلت و رسوائی کا ابدی اعلان ہے۔

ان دونوں واقعات میں حق و باطل کے معرکوں، دشمنوں کی خفیہ سازشوں اور انبیاء علیہم السلام کی حفاظت کے لیے وعدۂ الٰہی اور اس کے بے غل و غش پورا ہونے کا جو نقشہ قرآن عزیز نے پیش کیا ہے، تاریخی نگاہ سے ان پر غور فرمائیے اور فیصلہ کیجیے کہ جس خدا نے صالح (علیہ السلام) اور خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اپنے وعدۂ حفاظت کو اِس شانِ رفیع کے ساتھ پورا کیا ہو۔ کیا منتخبِ پنجاب کے عقیدہ کے مطابق اسی شانِ معجزانہ

کے ساتھ وہ عیسیٰ (علیہ السلام) کے حق میں پورا ہوا؟ نہیں ہرگز نہیں، حالانکہ آیاتِ قرآنی شاہد ہیں کہ ان دونوں واقعات کے مقابلہ میں عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) سے کیے گئے وعدے زیادہ واضح تفصیلات رکھتے ہیں اور ان میں صاف کہا گیا ہے کہ خدا کے بہترین مخفی فیصلہ کے مطابق حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے دشمن اُن کو ہاتھ تک نہ لگا سکیں گے، تب ہی تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے جن احسانات و انعامات کو شمار کرائے گا ان میں سے ایک بڑا انعام و احسان یہ بھی ہوگا:-

وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اور جبکہ ہم نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا تھا

متنبی پنجاب کو اگر اپنی نبوت اور مسیحیت کے افترا اور ڈھونگ کو مضبوط کرنے کیلیے حضرتِ مسیحؑ کے زندہ آسمان پر اُٹھائے جانے کے خلاف اس درجہ ناگواری تھی جیسا کہ متنبی کاذب کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے تب بھی یہود و نصاریٰ کی اس اندھی تقلید کے لیے مقابلہ میں جو نصوصِ قرآنی کے خلاف "کفر بواح" تک پہنچاتی اور حضرتِ مسیحؑ کی شانِ رفیع کے حق میں باعثِ توہین و تذلیل اور وعدۂ الٰہی کی تکذیب کرتی ہے" کیا یہ کافی نہیں تھا۔ کہ تاویلِ باطل[1] کے پردہ میں اتنا ہی کہہ دیا جاتا کہ وہ اگرچہ بقیدِ حیات آسمان پر نہیں اُٹھائے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے بند مکان سے کسی طریق پر اُن کو دشمنوں کے نرغے سے نکال کر محفوظ کر دیا اور دشمن کسی طرح ان کو نہ پا سکے، لیکن وائے برحالِ متنبی قادیان کہ خدا کے سچے پیغمبر حضرتِ عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کے ساتھ بغض و عناد نے "خسر الدنیا والآخرہ" کا مصداق بنا کر ہی چھوڑا۔

قادیانی تلبیس اور اس کا جواب

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے اِس معرکۃ الآرا مسئلہ میں جو اُن کی عظمت اور جلالت کا زبردست نشان ہے" سورۂ آلِ عمران کی آیات کا باہمی ربط اور

---

[1] تاویلِ باطل اس لیے کہ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دیگر نصوصِ قرآنی، حدیثی اور اجماعِ امت کے پیشِ نظر اس مقام پر یہ تاویل بلاشبہ "باطل" ہے مگر اس سے کم از کم حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی توہین اور وعدۂ الٰہی کی تکذیب کا پہلو نہیں نکلتا۔

ترتیبِ ذکری خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے کہ متنبّی کاذب نے اس میں بھی "تلبیس الحق بالباطل" کا ثبوت دے کر ناواقف کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرآنِ عزیز، سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے حضرتِ مسیحؑ کے دشمنوں کے نرغہ میں گھر جانے سے متعلق جس تسلی اور وعدہ کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطری شکل وصورت یہ پیش آئی کہ جب دشمنانِ دین نے حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کا ایک بند مکان میں محاصرہ کرلیا تو ایک اولوالعزم پیغمبر اور خدائے برحق کے درمیان تقرب کا جو رشتہ قائم ہے اس کے پیشِ نظر قدرتی طور پر حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اب کیا پیش آنے والا ہے، راہِ حق میں جاں سپاری یا قدرتِ الٰہی کا کوئی اور کرشمہ؟ اور اگر دشمنوں سے تحفظ کے لیے کوئی کرشمہ پیش آنے والا ہے تو اس کی کیا شکل ہوگی کیونکہ بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا، اور اگر تحفظ ہوا بھی تو کیا کچھ مصائب وآلام اٹھانے کے بعد تحفظِ جان ہوگا یا دشمن کسی بھی صورت میں قابو نہ پاسکیں گے؟ تب اللہ تعالیٰ نے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو مخاطب کرتے ہوئے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے قلب میں فطری طور پر پیدا ہونے والے سوالات کا ترتیب وار اِس طرح جواب دیا: "عیسیٰ! میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں تیری مقررہ مدتِ حیات پوری کروں گا یعنی مطمئن رہو کہ تجھ کو دشمن قتل نہ کرپائیں گے" (اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ) "اور صورت یہ ہوگی کہ اس وقت میں تجھ کو اپنی جانب یعنی ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھالوں گا" (وَرَافِعُكَ اِلَیَّ) اور یہ بھی اِس طرح نہیں کہ پہلے سب کچھ مصائب ہوگذریں گے اور پھر ہم تجھ کو آخر میں علاج معالجہ کراکر اٹھائیں گے، نہیں بلکہ یوں ہوگا کہ تو دشمن کے ناپاک ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رہے گا اور کوئی دشمن تجھ کو ہاتھ تک نہ لگا سکے گا (وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا) یہ تو تمہارے فطری سوالات کا جواب ہوا لیکن اس سے بھی زیادہ ہم یہ کریں گے کہ جو تیرے پیرو ہیں (خواہ غلط کار ہوں جیسا کہ نصاریٰ اور خواہ صحیح العقیدہ ہوں جیسا کہ مسلمان) ان کو قیامت تک یہود پر غالب رکھیں گے اور تا قیامِ قیامت کبھی ان کو حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہوگا، باقی رہا انجام

معاملات کا فیصلہ سوا اُس کے لیے (قیامت کا) دن مقرر ہے اس روز سب اختلافات ختم ہو جائیں گے اور حق و باطل کا دوٹوک فیصلہ کر دیا جائے گا۔

زیرِ بحث آیات کی یہ تفسیر جس طرح سلفِ صالحین اور اجماعِ امت کے مطابق ہے اسی طرح اس میں آیات میں کیے گئے متعدد وعدوں کی ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی مگر مرزائے قادیانی نے اپنی "مسندِ مسیحیت و نبوت" کو قائم کرنے کے لیے قرآن، احادیثِ صحیحہ اور اجماعِ اُمت کے خلاف جبکہ یہ دعوٰے کیا کہ حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) کی موت ہو چکی تو اس سلسلہ کی آیات میں تحریفِ معنوی کی ناکام سعی کو بھی ضروری سمجھا اور دعوٰی کیا کہ اگر مسیح (علیہ السلام) کی موت کے وقوع کو رفع الی السماء اور تطہیر اور تفوق المطیعین علی الکافرین سے قبل تسلیم نہ کیا جائے گا تو ترتیبِ ذکری میں فرق آجائے گا اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم ماننا پڑے گا اور یہ قرآنِ عزیز کی شانِ بلاغت کے خلاف ہے لہٰذا یہ ماننا چاہیے کہ "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ" کے وعدہ کا وقوع ہو چکا اور عیسٰی (علیہ السلام) پر موت آچکی۔

مرزائے قادیانی کی یہ "تلبیس" اگرچہ ان حضرات سے تو پوشیدہ نہیں رہ سکتی جو عربیت اور قرآن کے اسلوبِ بیان کا ذوق رکھتے ہیں لیکن عوام کو مغالطہ میں ڈال سکتی ہے اس لیے اس عنوان کے شروع ہی میں آیات کی تفسیر کو اس طرح بیان کر دیا گیا کہ مرزا کی جانب سے جو تلبیس کی گئی ہے وہ خود بخود زائل ہو جائے تاہم مزید تشریح کے لیے یہ اور اضافہ ہے کہ ترتیبِ ذکری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام میں اگر چند باتیں ترتیب وار ذکر کی گئی ہیں تو اُن کا وقوع بھی اس طرح ہونا چاہیے کہ اس کلام میں ذکر کردہ ترتیب بگڑنے نہ پائے اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنا نہ پڑے اور یہ جب ضروری ہے کہ کلام کی فصاحت و بلاغت کا تقاضہ ہی یہ ہو کہ ترتیبِ ذکری میں فرق نہ آنے پائے ورنہ تو بعض مقامات پر تقدیم و تاخیر کو بھی فصاحت کی جان سمجھا جاتا ہے اور یہ علمِ معانی کا مشہور مسئلہ ہے۔

پس قرآن کی ان آیات میں جمہور اہلِ اسلام کی تفسیر کے مطابق ترتیبِ ذکری بحالہٖ قایم ہے اس لیے کہ خدا کی جانب سے پہلا وعدہ یہ ہے کہ میں تمہاری مقررہ مدت پوری کروں گا "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ" یعنی تمہاری موت اِن دشمنوں کے ہاتھ سے نہیں ہوگی بلکہ تم اپنی طبعی موت سے مرو گے مگر اس پہلے وعدہ کو پورا کرنے کے لیے متعدد صورتیں ہو سکتی تھیں یہ کہ دشمنوں پر باہر سے اچانک حملہ ہو جائے اور وہ فرار ہو جائیں یا سب وہیں کھیت رہیں اور حضرت مسیح (علیہ السلام) ان کی زد سے بچ جائیں یا یہ کہ قوم عاد و ثمود کی طرح زمین یا آسمان سے قدرتی عذاب آکر ان سب کو ہلاک کر دے، یا یہ کہ حضرت مسیح کسی ترکیب سے ان کے نرغہ میں سے محفوظ نکل جائیں اور ان کی دسترس سے باہر ہو جائیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرشمۂ قدرت سے عیسیٰ (علیہ السلام) کو مکان بند رہتے ہوئے ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لے وغیرہ وغیرہ۔ تو قرآن نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خبر دی کہ پہلے وعدہ کا ایفاء مسطورہ بالا آخری شکل یعنی "وَرَافِعُکَ اِلَیَّ" کی شکل میں ہوگا اور ہوگا بھی ایسی قدرتِ کاملہ کے ہاتھوں کہ اس محاصرہ کے باوجود دشمن اپنے ناپاک ہاتھ تجھ کو نہیں لگا سکیں گے اور میں اُن کافروں کے ہاتھ سے تجھ کو پاک رکھوں گا "وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا"۔ اور ان باتوں کے علاوہ یہ بھی ہوگا کہ میں تیرے پیروؤں کو تیرے منکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا، بہرحال بعد کے یہ تینوں وعدے بالترتیب جب ہی عمل میں آئیں گے کہ پہلے وعدۂ اوّل وقوع پذیر ہو جائے یعنی تیری موت ان کے ہاتھوں نہ ہو بلکہ اپنی مقررہ مدت پر پہنچ کر طبعی موت آئے۔ ان آیات میں پہلے وعدہ کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ میں اوّل تجھ کو ماروں گا اور پھر بالترتیب یہ سب امور انجام دوں گا، کیونکہ یہ قول صرف جاہل ہی کہہ سکتا ہے لیکن جس کو گفتگو کا معمولی بھی سلیقہ ہے وہ ہرگز ایسا کہنے کی جرأت نہیں کرے گا کیونکہ ترتیبِ ذکری کے لیے یہ تو ہونا چاہیے کہ ان امور کے وقوع میں ایسی صورت نہ پیدا ہو جائے کہ ترتیب میں فرق لاکر تقدیم و تاخیر کا عمل جراحی کرنا پڑے لیکن اگر کوئی شے زمانہ کا امتداد اور طوالت چاہتی ہے

اور اس کا آخری حصہ وقوع ان تمام امور کے بعد پیش آتا ہے جو اس کے بعد مذکور تھے مگر ترتیبِ ذکری میں مطلق کوئی فرق نہیں آتا تو ایسی شکل میں اس وقوع کے متأخر ہو جانے سے کسی عالم کے نزدیک بھی کلام کی فصاحت و بلاغت میں نقص واقع نہیں ہوتا اور نہ اس قسم کے وقوعِ ترتیبی کا ترتیبِ ذکری کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا ہے۔

پس مسئلہ زیرِ بحث میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی طبعی موت کا وقوع کبھی بھی ہو اس کا ترتیبِ ذکری سے مطلق کوئی علاقہ نہیں ہے، یہاں تو "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ" کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ دیے گئے متعدد وعدوں میں پہل اور اولیت اس وعدہ کو حاصل ہے کہ تمہاری موت کا سبب یہ یہود بنی اسرائیل نہیں ہوں گے بلکہ جب بھی یہ مقررہ مدت پوری ہوگی اس طریق پر ہوگی جو عام طور سے میری جانب منسوب کی جاتی ہے (یعنی طبعی موت) اور یہ وعدہ بہرحال باقی تین وعدوں سے پہلے ہی رہا تب ہی تو یہ تینوں وعدے وقوع میں آسکے، اور اگر کہیں دشمن حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی موت کا سبب بن گئے ہوتے تو پھر "رفع" اور "تطہیر" کے لیے کوئی صورت ہی نہ رہ جاتی اور مرزا کادیانی کی طرح باطل اور رکیک تاویلات کی آڑ لینی پڑتی اور آیاتِ زیرِ بحث کی "روح" فنا ہو کر رہ جاتی۔ اور یہ اس لیے کہ اگر "رفع" سے رفعِ روحانی اور "تطہیر" سے روحانی پاکی مُراد لیے جائیں تو یہ قطعاً بے محل و بے موقع ہوگا کیونکہ قرآن کے ارشاد کے مطابق یہ وعدے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو دیے جا رہے ہیں تو حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ بتانا کہ تمہارے متعلق یہود کا یہ اعتقاد کہ تم کاذب اور ملعون ہو" غلط ہے اور تم مطمئن رہو کہ میں تمہارا رفعِ روحانی کرنے والا ہوں قطعاً عبث تھا کیونکہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) پیغمبرِ خدا ہیں اور جانتے ہیں کہ یہود کا افتراء کیا حقیقت رکھتا ہے، نیز یہود کو حضرتِ مسیح کے رفعِ روحانی کا پتہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ معاملہ عالمِ غیب سے متعلق ہے تو خدائے برتر کا یہ ارشاد نہ حضرتِ مسیح کی برمحل تسلی کا باعث ہو سکتا تھا اور نہ یہود کے لیے سود مند اور یہی حال دوسرے وعدۂ تطہیر کا ہے بلکہ جب بقولِ کادیانی

یہود کے ہاتھوں حضرت مسیحؑ صلیب پر چڑھا دیے گئے تو نعش پا لینے کے بعد شاگردوں کا مرہم عیسیٰ لگا کر چنگا کر لینے اور پھر منجانب اللہ جن کی ہدایت و ارشاد کے لیے مامور کیے گئے تھے ان سے جان بچا کر بھاگ جانے اور زندگی بھر گمنامی میں زندگی بسر کرتے رہنے کے بعد "رَافِعُكَ اِلَيَّ" اور "مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" کہہ دینے سے نہ یہود کے عقیدۂ متعلق مسیحؑ کی ہی تردید ہوگی اور نہ ایک غیر جانبدار انسان ہی یہ سمجھ سکے گا کہ ایسے موقع پر جبکہ عیسیٰ (علیہ السلام) دشمنوں کے نرغے میں ہیں اور جبکہ اُن کو یہ یقین ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور موت کے بعد رفعِ روحانی اور تطہیر لازم شے ہے" ان تسلیوں اور وعدوں کا کیا فائدہ ہے خصوصاً جبکہ ان کے ساتھ دشمن نے وہ سب کچھ کر لیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔

البتہ جمہور اہلِ حق کی تفسیر کے مطابق آیاتِ قرآنی کی روح اپنی معجزانہ بلاغت کے ساتھ پوری طرح ناطق ہے کہ یہ وعدے حضرت مسیحؑ سے جس طرح کیے گئے وہ برمحل و فطری اضطراب کے لیے بلاشبہ باعثِ تسکین ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کا وقت کے یہود و نصاریٰ کے وراثتی عقائدِ باطلہ کی تردید کے لیے کافی اور مدلل۔

جمہور اہلِ حق کی یہ تفسیر "توفی" کے معنی "مقررہ مدت پوری کرنا" اختیار کر کے کی گئی ہے جس کا حاصل (توفی بمعنی موت) نکلتا ہے لیکن توفی کے یہ حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ بطور کنایہ کے مستعمل ہوتے ہیں کیونکہ لغتِ عرب میں اس کا مادہ (مصدر) وفیٰ، یفی، وفاءً ہے جس کے معنی "پورا کرنے" کے آتے ہیں اور اس کو جب بابِ تفعّل میں لے جا کر "توفی" بناتے ہیں تو اس کے معنی "کسی شے کو پورا پورا لے لینا" یا "کسی شے کو سالم قبضہ میں کر لینا" آتے ہیں (توفی اخذہ وافیاً تاماً یقال "توفیت من فلان مالی علیہ") اور چونکہ موت میں بھی اسلامی عقیدہ کے مطابق روح کو پورا لے لیا جاتا ہے اس لیے کنایہ کے طور پر کہ جس میں حقیقی معنی بحالہٖ محفوظ رہا کرتے ہیں "توفی" بمعنی موت مستعمل ہوتا ہے اور کہتے ہیں "توفاہ اللہ ای امانہ" لیکن

اگر موقع پر دوسرے دلائل ایسے موجود ہوں جن کے پیشِ نظر توفّی کے حقیقی معنی لیے جا سکتے ہوں یا حقیقی کے ماسوا دوسرے معنی بن ہی نہ سکتے ہوں تو اس مقام پر خواہ فاعل "اللہ تعالیٰ" اور مفعول "ذی روح انسان" ہی کیوں نہ ہو وہاں حقیقی معنی "پورا لے لینا" ہی مراد ہوں گے مثلاً آیت "اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا" "اللہ پورا لے لیتا ہے جانوں کو اُن کی موت کے وقت اور اُن جانوں کو جن کو ابھی موت نہیں آئی ہے پورا لے لیتا ہے نیند میں" "وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ" کے لیے بھی لفظ "توفّی" بولا گیا یعنی ایک جانب یہ صراحت کی جا رہی ہے کہ یہ وہ جانیں (نفوس) ہیں جن کو موت نہیں آئی اور دوسری جانب یہ بھی بصراحت کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیند کی حالت میں ان کے ساتھ "توفی" کا معاملہ کرتا ہے تو یہاں اللہ تعالیٰ فاعل ہے "متوفی" اور نفس انسانی مفعول ہے "متوفّی" مگر پھر بھی کسی صورت سے "توفی بمعنی موت" صحیح نہیں ہیں ورنہ تو قرآن کا جملہ "وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ" العیاذ باللہ مہمل ہو کر رہ جائے گا یا مثلاً "وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ" (اور وہی (اللہ) ہے جو پورا لے لیتا یا قبضہ میں کر لیتا ہے تم کو رات میں اور جانتا ہے جو تم کماتے ہو دن میں[2]) میں بھی کسی طرح توفی بمعنی موت نہیں بن سکتے حالانکہ توفی کا فاعل اللہ اور مفعول انسانی نفوس ہیں، یا مثلاً آیت "حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا"[3] "یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت، قبض کر لیتے ہیں یا پورا لے لیتے ہیں اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے)" میں ذکر موت ہی کا ہو رہا ہے لیکن پھر بھی "تَوَفَّتْهُ" میں توفّی کے معنی موت کے نہیں بن سکتے ورنہ بے فائدہ تکرار لازم آئے گا، یعنی "اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ" میں جب لفظ "موت" کا ذکر آچکا تو اب "تَوَفَّتْهُ" میں بھی اگر توفی کے معنی موت ہی کے لیے جائیں تو ترجمہ یہ ہوگا، یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت، موت لے آتے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں دوبارہ لفظِ موت کا ذکر بے فائدہ ہے اور کلام فصیح و بلیغ اور معجز تو کیا روزمرہ کے محاورہ

[1] سورۂ زمر۔ [2] سورۂ انعام۔ [3] انعام۔

اور عام بول چال کے لحاظ سے بھی پست اور لاطائل ہو جاتا ہے البتہ اگر "توفی" کے حقیقی معنی کسی شے پر قبضہ کرنا یا اس کو پورا لے لینا" مراد لیے جائیں تو قرآن عزیز کا مقصد ٹھیک ادا ہوگا اور کلام بھی اپنے حدِ اعجاز پر قائم رہے گا۔

اب ہر ایک عاقل غور کر سکتا ہے کہ یہ دعویٰ کرنا کہ "توفی" کے حقیقی معنی موت کے ہیں۔ خصوصاً جبکہ فاعل خدا ہو اور مفعول ذی روح کہاں تک صحیح اور درست ہے۔

بہرحال اس موقع پر "موت" اور "توفی" دونوں کا ساتھ ساتھ بیان ہونا اور دونوں کا ایک ہی معمول ہونا اور پھر دونوں کے معنی میں فرق و تفاوت اس بات کے لیے واضح دلیل ہے کہ یہ دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں اور جس طرح لیث و اسد (بمعنی شیر) ابل و جمل (بمعنی اونٹ) نون و حوت (بمعنی مچھلی) وغیرہ اسماء کا اور جمعٌ، شملٌ، کسبٌ (بمعنی جمع ہونا) اور لبثٌ مکثٌ (بمعنی ٹھہرنا) اور عطشٌ، ظمأٌ (پیاس) اور جوعٌ، سغبٌ (بمعنی بھوک) مصادر کا حال ہے، موت اور توفیٰ کے درمیان وہ معاملہ نہیں ہے بلکہ ان کے حقیقی معانی میں نمایاں فرق ہے۔ اور مثلاً آیت "فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ" پس روکے رکھو اُن (عورتوں) کو گھروں میں یہاں تک کہ لے لے ان کو موت" میں موت کو فعل اور توفّی کا فاعل قرار دیا گیا ہے اور ہر ایک زبان کی نحو (گرامر) کا یہ مسئلہ ہے کہ فاعل اور فعل ایک نہیں ہوتے کیونکہ فعل، فاعل سے صادر ہوتا ہے، عین ذات فاعل نہیں ہوا کرتا تو اس سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ توفّی کے حقیقی معنی "موت" کے ہرگز ہرگز نہیں ہیں ورنہ اس کا اطلاق جائز نہیں ہو سکتا۔

اِن تین مقامات کے علاوہ سورۂ بقرہ کی آیت:۔

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ پھر پورا دیا جائے گا ہر ایک نفس کو جو کچھ اس نے کمایا ہے۔

اور سورۂ نحل کی آیت:

وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ اور پورا دیا جائے گا ہر نفس کو جو کچھ اس نے کمایا ہے۔

میں بھی توفّی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول نفسِ انسانی ہے تاہم یہاں توفّی بمعنی موت نہیں بن سکتے اور یہ بہت واضح اور صاف بات ہے۔

غرض ان آیات میں باوجود اِس امر کے کہ "توفّی" کا فاعل اللہ تعالیٰ اور اس کا مفعول "انسان یا نفسِ انسانی" ہے پھر بھی باجماعِ اہلِ لغت و تفسیر "موت کے معنی" نہیں ہو سکتے خواہ اس لیے کہ دلیل اور قرینہ اس معنی کے خلاف ہے اور یا اس لیے کہ اس مقام پر توفّی کے حقیقی معنی (پورا لے لینا یا قبض کر لینا) کے باسوائے "موت کے معنی" کسی طرح بن ہی نہیں سکتے۔

تو مرزائے کادیانی کا یہ دعویٰ کہ "توفّی" اور "موت" مرادف الفاظ ہیں یا یہ کہ توفّی کا فاعل اگر اللہ تعالیٰ اور مفعول انسان یا نفسِ انسانی ہو تو اُس جگہ صرف "موت" ہی کے معنی ہونگے، دونوں دعوے باطل اور نصوصِ قرآنی کے قطعاً خلاف ہیں۔ "فَهَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ"

توفّی اور موت یقیناً مرادف الفاظ نہیں ہیں اور توفّی کے حقیقی معنی "موت" نہیں بلکہ "پورا لے لینا یا قبض کر لینا" ہیں۔ قرآنِ عزیز سے اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ پورے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی موت کا فاعل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا گیا مگر اس کے برعکس توفّی کا فاعل متعدد مقامات پر ملائکہ (فرشتوں) کو ٹھیرایا ہے مثلاً سورۂ نساء میں ہے: إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ بیشک وہ لوگ جن کو فرشتوں نے قبض کر لیا یا پورا پورا لے لیا، اور سورۂ انعام میں ہے: "تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا" قبض کر لیا یا پورا لے لیا اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتوں) نے اور سورۂ سجدہ میں ہے: "قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ" (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے قبض کرے گا تم کو موت کا فرشتہ) اور سورۂ انفال میں ہے: وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ قبض کرتے ہیں فرشتے اُن لوگوں (کی رُوحوں) کو جنھوں نے کفر کیا ہے۔

اِن تمام مقامات پر اگرچہ توفّی "کنایۃً" بمعنی موت استعمال ہوا ہے لیکن پھر بھی چوں کہ

اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی بجائے ملائکہ اور ملک الموت کی جانب ہو رہی تھی اس لیے لفظِ "توفّی" کا اطلاق کیا گیا اور لفظ "موت" استعمال نہیں کیا گیا اور یہ صرف اس لیے کہ موت تو اللہ کا فعل ہے اور موت کے وقت انسان کا یعنی روحِ انسانی کا قبض کرنا اور اُس کا پُورا پُورا لے لینا یہ فرشتوں کا عمل ہے، تو جن مقامات میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جب خدا کسی کی اجل پوری کر دیتا اور موت کا حکم صادر فرماتا ہے تو اس کی صورتِ عمل کیا پیش آتی ہے ان مقامات میں موت کا اطلاق ہرگز موزوں نہیں تھا بلکہ "توفّی" کا لفظ ہی اس حقیقت کو ادا کر سکتا تھا۔

موت اور توفّی کے درمیان قرآنی اطلاقات کے پیشِ نظر ایک بہت بڑا فرق یہ بھی ہے کہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ "موت" اور "حیات" کو تو مقابل ٹھیرایا ہے لیکن "توفّی" کو کسی ایک مقام پر بھی "حیات" کا مقابل قرار نہیں دیا۔ مثلاً سورۂ ملک میں ہے: "هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ ـــــ خدا ہی وہ ذات ہے جس نے پیدا کیا موت کو اور زندگی کو" اور سورۂ فرقان میں ہے "وَلَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً - اور وہ نہیں مالک ہیں موت کے اور نہ حیات کے"۔ اور اسی طرح ان دونوں کے مشتقات کو مقابل ٹھیرایا ہے مثلاً "كَیْفَ نُحْیِی الْمَوْتٰی" "یُحْیِی الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" "فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" "وَاُحْیِیَ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ" "وَهُوَ یُحْیِی الْمَوْتٰی" (وغیر ذلک کثیرا) البتہ توفّی کے حقیقی معنی میں چونکہ یہ وسعت موجود ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے موت کی جو حقیقت ہے بطریقِ کنایہ اس پر بھی حسبِ موقع اس کا اطلاق ہو سکتا ہے تو یہ استعمال اور اطلاق بھی جائز ٹھیرا اور اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔

"توفّی" کے معنی کی اس مفصل تشریح و توضیح کا حاصل یہ ہوا کہ لغتِ عرب اور قرآنی اطلاقات دونوں اس کے شاہد ہیں کہ توفّی اور موت دونوں کے حقیقی معنی میں بھی اور دونوں کے اطلاقات میں بھی واضح فرق ہے اور دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں خواہ توفّی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول "انسان اور رُوحِ انسانی" ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اسلامی نقطۂ نظر سے چونکہ موت ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس پر بطریقِ "توسّع" اور "کنایہ" توفّی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے پس جس

لہ بقرہ، نساء، مومن، یونس، نحل، زمر، عنکبوت، شوریٰ

مقام پر قرینہ اور محلِ استعمال کا تقاضہ یہ ہوگا کہ وہاں توفّی بول کر کنایۃً موت کے معنی لیے جانے چاہئیں تو اس جگہ "موت" کے معنی مراد ہوں گے لیکن اس کے برعکس اگر دلیل، قرینہ اور محلِ استعمال حقیقی معنی کا متقاضی ہے تو اس جگہ وہی معنی مراد ہوں گے اور ان ہی کو مقدم سمجھا جائے گا خواہ کنائی معنی وہاں قطعاً نہ بن سکتے ہوں اور خواہ بن سکتے ہوں مگر محلِ استعمال اور دوسرے دلائل اس کو مرجوح یا ممنوع قرار دیتے ہوں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد لغت کے مشہور امام ابو البقا نے یہ تصریح کی ہے کہ عوام میں توفّی کے معنی اگرچہ "موت" کے سمجھے جاتے ہیں مگر خواص کے نزدیک اس کے معنی "پورا لے لینا" اور "قبض کرنا" ہیں فرماتے ہیں: التوفی الاماتۃ وقبض الروح وعلیہ استعمال العامۃ والاستیفاء واخذ الحق وعلیہ استعمال البلغاء۔

الحاصل، سورۂ مائدہ کی آیت "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ" میں اگر حقیقی معنی مراد ہوں جیسا کہ جلیل القدر علماء تفسیر و لغت نے اختیار کیے ہیں۔ تب بھی مرزائے کادیانی کے علی الرغم آیاتِ زیرِ بحث کا یہ مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ تسلی دی گئی "اے عیسیٰ! میں تجھ کو پورا پورا لے لینے والا ہوں یا تجھ کو قبض کرنے والا ہوں اور صورت یہ ہوگی کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاءِ اعلیٰ کی جانب) اُٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو دشمنوں کے ناپاک ہاتھوں سے پاک رکھنے والا ہوں الخ" یعنی جب شروع میں یہ بتایا کہ تجھ کو قبض کر لیا جائے گا یا پورا لے لیا جائے گا تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ قبض کرنے اور پورا لے لینے کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً ایک یہ کہ موت آجائے اور رُوح کو قبض کر لیا جائے اور پورا لے لیا جائے اور دوسری یہ کہ زندہ ملاءِ اعلیٰ کی جانب (اپنی جانب) اُٹھا لیا جائے تو یہاں کونسی صورت پیش آئے گی پس اس کو صاف اور واضح کرنے کے لیے کہا گیا کہ دوسری شکل اختیار کی جائے گی تاکہ دشمنوں کی سازشوں کے مقابلہ میں معجزانہ تدبیر کے ذریعہ وعدۂ الٰہی "وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ" پورا ہو اور "وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ" کا عظیم الشان مظاہرہ ہو جائے اور "توفّی" اور

"رفع" ہو جانے پر نتیجہ یہ نکلے کہ ذاتِ اقدس کافروں کے ہاتھ سے بہر طرح محفوظ ہو جائے اور اِس طرح وعدۂ ربانی "وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا" بغیر کسی تاویل کے صحیح ہو جائے، اور تاویلِ باطل کے ذریعہ شک اور تردد یا حقیقتِ حال سے انکار صرف ان ہی قلوب کا حصہ رہ جائے جو قرآن سے علم حاصل کرنے کی بجائے اوّل اپنے ذاتی اوہام وظنون کو راہنما بناتے اور پھر قرآن کے منطوق ومفہوم کے خلاف اس کے مُنہ میں اپنی زبان رکھ دینا چاہتے ہیں اور اس سے وہ کہلانا چاہتے ہیں جو وہ خود کہنا نہیں چاہتا مگر وہ قرآنِ عزیز کی اس صفت سے غافل رہتے ہیں" لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ" اس قرآن کے آگے سے اور نہ اُس کے پیچھے سے (کسی جانب سے بھی) باطل نہیں پھٹک سکتا، یہ اُتارا ہوا ہے ایسی ہستی کی جانب سے جو حکمت والی، خوبیوں والی ہے"۔

منتخبی پنجاب کو جب قرآنِ عزیز کی ان نصوص سے متعلق تحریفِ معنوی میں ناکامی ہوئی اور خسران کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تو مجبور ہو کر اور قرآنِ عزیز کے اطلاقات، احادیثِ صحیحہ کی اطلاعات اور اجماعِ اُمت کے فیصلہ کو پسِ پُشت ڈال کر "فلسفہ" کی آغوش میں پناہ لینے کا کا ارادہ کیا اور اپنی تصانیف میں یہ ہرزہ سرائی کی کہ اگر حضرت مسیحؑ آسمان پر زندہ اُٹھا لیے گئے تو یہ عقل کے خلاف ہے اس لیے کہ کوئی مادی جسم ملاءِ اعلیٰ تک پرواز نہیں کر سکتا اور کر بھی جاتا تو اتنی طویل مدت کیسے زندہ ہے اور وہاں کھانے، پینے اور رفعِ حاجت کرنے کی صورت کیسے عمل میں آسکتی ہے؟

قدرتِ الٰہی کے معجزانہ افعال کو خلافِ عقل کہہ کر بات اگر ختم ہو سکتی تو شاید کادیانی کی یہ فلسفیانہ موشگافی درخورِ اعتناء سمجھی جا سکتی۔ لیکن آج فلسفۂ جدید بشکل سائنس ترقی کر کے جس حد تک پہنچ چکا ہے وہاں نظریات (THIORIS) نہیں بلکہ مشاہدات اور عملیات (PRACTICLES) اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ فضاء کے موانعات کو اگر آہستہ آہستہ ہٹا دیا جائے یا اُن کو ضبط (CANTROL) میں لے آیا جائے تو مادی جسم کے لیے غیر معلوم

بلندی تک پہنچنا ممکن العمل ہو جائے گا اور اس کے لیے جو جدوجہد وہ کر رہے ہیں وہ ممکن العمل سمجھ کر ہی کر رہے ہیں اور سائنٹفک (SCINTIFIC) طریقہ پر کر رہے ہیں پس اگر آج کا انسان میلوں اوپر ہوائی جہاز کے ذریعہ جا سکتا ہے اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہزاروں میل سے مادی انسان کے ساتھ باتیں کرتے وقت اس کے جسم کی تصویر لے سکتا ہے اور ہوا اور آفتاب کی لہروں اور شعاعوں پر کنٹرول کر کے ہزاروں میل تک اپنی آواز کو بذریعہ ریڈیو نشر کر سکتا ہے اور ہزاروں برس کے گذرے ہوئے واقعات کو فضا میں نظم کر کے آج اس طرح سنا سکتا ہے گویا وہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے تو اس انسان کے خالق بلکہ خالقِ کائنات کے متعلق ازرہِ تفلسف یہ کہنا کہ وہ مادی جسم کو ملاءِ اعلیٰ تک کیسے لے جا سکتا ہے' اپنی غباوت پر مہر کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

اور اگر ادویات اور غذاؤں اور حفظانِ صحت کے مختلف طریقوں سے عمرِ طبعی کو دوگنا اور تین گنا کیا جا سکتا اور کیا جا رہا ہے نیز اگر مختلف غذاؤں کے اثرات و نتائج میں یہ فرق ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ کسی سے فضلہ زیادہ بنے اور کسی سے بہت کم بنے اور کسی سے قطعاً نہ بنے بلکہ وہ خالص خون کی شکل میں تحلیل ہو جائے اور اگر انسان اپنی ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ روحانی قوت کو بڑھا کر آج اس دُنیا میں دنوں' ہفتوں بلکہ مہینوں بغیر خورد و نوش زندہ رہ سکتا ہے تو مجبور انسانوں کی ان کامیاب کوششوں کو صحیح سمجھنے کے باوجود خالقِ ارض و سماوات کی جانب حضرتِ مسیحؑ کی رفعتِ آسمانی پر مسطورۂ بالا شکوک پیش کرنا یا ان کے پیشِ نظر ان کے بجسدِ عنصری ملاءِ اعلیٰ تک پہنچنے اور وہاں زندہ رہنے کا انکار کرنا اگر جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص علمی حقائق سے ناآشنا اور علومِ قرآن سے محروم ہے وہ "خلافِ عقل" اور "ماورائے عقل" ان دونوں باتوں کے درمیان فرق کرنے سے عاجز ہے اور اس لیے ہمیشہ ماورائے عقل کو خلافِ عقل کہہ کر پیش کرتا رہتا ہے۔

دراصل انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ صرف دو ہی باتیں ہیں ایک یہ کہ انسان "عقل" سے اس درجہ بے بہرہ ہو جائے کہ ہر ایک بات بے سمجھے بوجھے مان لے اور اندھوں کی طرح ہر ایک راہ پر چلنے لگے، دوسری بات یہ کہ جو حقیقت بھی عقل سے بالاتر نظر آئے اس کو فوراً جھٹلا دے اور یہ یقین کر لے کہ جس شے کو اس کی سمجھ یا چند انسانوں کی سمجھ ادراک نہیں کر سکتی وہ شے حقیقۃً وجود نہیں رکھتی اور تکذیب کے لائق ہے حالانکہ بہت سی باتیں وہ ہیں جو ایک دور کے تمام عقلاء کے نزدیک ماوراءِ عقل سمجھی جاتی ہیں، اس لیے کہ ان کی عقلیں ان باتوں کا ادراک کرنے سے عاجز رہیں مگر وہی باتیں علمی ترقی کے دوسرے دور میں جا کر نہ صرف ممکن الوقوع قرار پاتی بلکہ مشاہدہ اور تجربہ میں آجاتی ہیں پس اگر ہر ایک وہ شے جو کسی ایک انسان یا جماعت یا اس کے دور کے تمام اہلِ عقل کے نزدیک ماوراءِ عقل تھی "خلافِ عقل" کہلانے کی مستحق تھی تو وہ دوسرے دور میں کیوں عقل کیلئے ممکن ہوئی بلکہ مشاہدہ میں آگئی۔

قرآن عزیز نے گمراہی کی اس پہلی حالت کو (جہل، ظن، خرص، اُنکل) سے تعبیر کیا ہے اور دوسری حالت کو "الحاد" کہا ہے اور یہ دونوں حالتیں "علم و عرفان" سے محرومی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

خلافِ عقل اور ماوراءِ عقل کے درمیان یہ فرق ہے کہ خلافِ عقل بات وہ ہو سکتی ہے جس کے نہ ہو سکنے کے متعلق علم و یقین کی روشنی میں مثبت دلائل و براہین موجود ہوں اور عقل، دلیل و برہان اور علمِ یقین سے یہ ثابت کرتی ہو کہ ایسا ہونا ناممکن اور محالِ ذاتی ہے اور ماوراءِ عقل اس بات کو کہتے ہیں کہ بعض باتوں کے متعلق عقل ہی کا یہ فیصلہ ہے کہ چونکہ انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا اور حقیقت اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی لہٰذا ہر وہ بات جو عقل کے احاطہ میں نہ آسکتی ہو مگر اس کے انکار پر علم و یقین کے ذریعہ برہان و دلیل بھی دی جا سکتی ہوں تو ایسی بات کو خلافِ عقل نہیں بلکہ ماوراءِ عقل کہیں گے۔

خلافِ عقل اور ماوراءِ عقل کے درمیان امتیاز ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جن چیزوں کو کل کی دنیا میں عام طور پر خلافِ عقل کہا جاتا رہا ان کو اہلِ دانش و بینش نے خلافِ عقل نہ سمجھتے ہوئے موجودہ

دور میں ممکن بلکہ موجود کر دکھایا اور کل یہی عقل کی ترقی آج کی بہت سی ماوراء عقل باتوں کو احاطۂ عقل میں لا سکے گی اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

پس جو شخص حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بجسدِ عنصری رفع الی السماء کا اس لیے منکر ہے کہ عقلی فلسفہ اس کا انکار کرتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ "برہان و دلیل اور علم و یقین کی جگہ محض جہل، ظن، اٹکل کے ماتحت ہے اور ایسے حضرات کے لیے پھر عالمِ غیب کی تمام ماوراءِ عقل باتوں، مثلاً وحی، فرشتہ، جنت، جہنم، حشر، معاد، معجزہ وغیرہ تمام باتوں کو خلافِ عقل کہہ کر جھٹلا دینا چاہیے قرآن عزیز نے ان ہی جیسے منکرینِ حق کے متعلق صاف صاف مکذبین کا لقب تجویز کر دیا ہے

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ	نہیں یہ بات نہیں ہے (جیسا کفار کہتے ہیں) اصل حقیقت یہ ہے
وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَٰلِكَ	کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اور جس بات کا نتیجہ
كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ	ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے۔ ٹھیک
فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ	اسی طرح انھوں نے بھی جھٹلایا تھا جو اُن سے پہلے گذر چکے
الظَّالِمِينَ (یونس پ ۱۱ ع)	ہیں تو دیکھو ظلم کرنے کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے۔

آیت میں كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ کہہ کر جس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے "یعنی انسان کی عقل جس بات کا ادراک نہ کر سکے اس کو دلیل و برہان اور علم و یقین کے بغیر ہی جھٹلا دینا اور صرف اس بنا پر انکار کر دینا کہ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے" اس کی ایک نظیر مرزائے قادیانی کا وہ انکار ہے جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے "رفع الی السماء" سے متعلق ہے اور اس کے خلیفہ مسٹر لاہوری کی موشگافیاں بھی اسی بے دلیل انکار و جحود کا شعبہ ہیں۔

اس حربہ کو بھی کمزور سمجھ کر متنبی پنجاب نے پھر رُخ بدلا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس موقع کے علاوہ قرآن کے کسی مقام سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ "رفع" سے "رفعِ روحانی" کے ماسوا کوئی معنی لیے گئے ہیں یعنی مادی شے کی جانب رفع کی نسبت کی گئی ہو لہٰذا اس مقام پر بھی رفعِ روحانی کے علاوہ معنی لینا قرآن کے اطلاق و استعمال کے خلاف ہے۔

مگر متبنّی کا ذب کا یہ دعویٰ اوّل تو بنیاد اً ہی غلط ہے کیونکہ اگر کسی لفظ کے محلِ استعمال سے یا قرآن ہی کی دوسری نصوص سے ایک معنی متعین ہیں تب یہ سوال پیدا کرنا کہ "یہی استعمال دوسرے کسی مقام پر جب تک ثابت نہیں ہوگا قابلِ تسلیم نہیں" حد درجہ کی نادانی ہے تاوقتیکہ دلیل سے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ لغتِ عرب میں اس لفظ کا اس معنی میں استعمال جائز ہی نہیں اور اگر اتمامِ حجت کے طور پر اس قسم کے بےمعنی سوال یا دعوے کو قابلِ جواب، یا لائقِ رد سمجھا ہی جائے تو سورۂ والنازعٰت کی یہ آیت کافی و وافی ہے:۔

ءَاَنتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا (اے افرادِ نسلِ انسانی) خلقت اور پیدائش کے لحاظ سے کیا تم زیادہ
رَفَعَ سَمْكَهَا۔ (النازعٰت پ۳۰ ع۱) بھاری اور پُرحمل ہو یا آسمان جس کو خدا نے بنایا اور اس کے پُرحمل جسم کو بلند کیا۔

اور ایک آسمان پر ہی کیا موقوف ہے یہ ہم سے لاکھوں اور کروڑوں میل دور فضا میں سورج، چاند اور ستاروں کو خدائے برتر نے جو بلندی اور رفعت عطا کی ہے کیا یہ سب کے سب مادی اجسام نہیں ہیں؟ اور اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو جس خالقِ ارض و سماوات نے ان مادی اجسام کا رفعِ آسمانی کیا ہے وہ اگر ایک انسانی مخلوق کا رفعِ آسمانی کر دے تو اس کو قرآن کے اطلاق و استعمال کے خلاف کہنا عناد اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے البتہ ثبوت درکار ہے تو اس کے لیے قرآن عزیز کی نصوصِ صحیح احادیث اور اجماعِ اُمت سے زیادہ موثق ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کا رفعِ سماوی اور چند جذباتی باتیں

مرزائے کادیانی نے اگرچہ اس مسئلہ میں جمہور کے خلاف یہود و نصاریٰ کی پیروی میں تحریفِ مطالب کی کافی سعیِ ناکام کی ہے اور مسٹر لاہوری نے بھی تفسیرِ قرآن میں تحریفِ معنوی کے ذریعہ اپنے مقتدا کی مدد کی تاہم دل کا چور اُن کو مطمئن نہیں کر سکا اور اس لیے انھوں نے دلائل و براہین کی جگہ جذبات کو دلیلِ راہ بنایا اور کبھی تو یہ کہا کہ جو لوگ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو آسمان پر زندہ تسلیم کرتے ہیں وہ ان کو خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت دیتے ہیں کہ آپؐ زمین پر ہوں اور

حضرت عیسیٰؑ آسمان پر، یہ تو سخت توہین کی بات ہے۔

لیکن علمی حلقوں میں اِس لچر اور لوچ جذبہ کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے جبکہ ہر ایک مذہبی انسان اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ اگرچہ فرشتے ہمیشہ بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ میں موجود اور سکونت پذیر ہیں تاہم اُن سب کے مقابلہ میں بلکہ اُن کی جلیل القدر ہستیوں مثلاً جبرئیل و میکائیل کے مقابلہ میں بھی ایک مفضول سے مفضول نبی کا رتبہ بہت بلند اور عالی ہے حالانکہ وہ نبی زمین پر مقیم رہا ہے اور جبرئیلؑ کا قیام ملاءِ اعلیٰ کے بھی بلند تر مقام پر رہتا ہے چہ جائیکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبۂ جلیل کہ جس کی عظمت ——— "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" میں مضمر ہے، علاوہ ازیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شبِ معراج میں "قاب قوسین او ادنیٰ" کا جو تقرب پایا ہے وہ نہ کسی مَلک اور فرشتہ کو حاصل ہوا اور نہ کسی نبی اور رسول کو اِس لیے حضرت مسیحؑ کا رفع آسمانی اُس "رفعت" کو پہنچ ہی نہیں سکتا جو اسریٰ میں آپ کو حاصل ہوئی۔ بہرحال فاضل و مفضول کے درمیان فرقِ مراتب کے لیے تنہا ملاءِ اعلیٰ کا قیام معیارِ فضیلت نہیں ہے خصوصاً اُس افضل ہستی کے مقابلہ میں جس کی فضیلت کا معیار خود اس کا وجود باجود ہو اور جس کی ذاتِ قدسی صفات خود ہی منبعِ فضائل اور مرجعِ کمالات ہو ایسی ہستی سے تو "مقام" عزت و مرتبہ پاتا ہے نہ کہ وہ ذاتِ گرامی۔

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری — آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور کبھی یہ کہا کہ جو شخص عیسیٰ (علیہ السلام) کو زندہ تسلیم کرتا ہے وہ "العیاذ باللہ" نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس لیے توہین کرتا ہے کہ وہ بقیدِ حیات نہیں رہے اور اِس طرح حضرت عیسیٰؑ کو پھر ذاتِ اقدس پر برتری حاصل ہو گئی۔

یہ قولہ پہلے سے بھی زیادہ بے کیف اور بے معنیٰ ہے بلکہ سرتاسر غلط بنیاد پر قائم، اس لیے کہ کون اہلِ عقل اور ذی ہوش کہہ سکتا ہے کہ "زندگی" بھی فاضل و مفضول کے درمیان معیارِ فضیلت ہے، اِس لیے کہ زندگی کی قیمت ذاتی کمالات و فضائل سے ہے نہ اس لیے کہ وہ

زندگی ہے پھر معیارِ فضیلت" کی اس بحث سے قطعِ نظر اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلہ فضیلت کو درمیان لانا اس لیے بھی قطعاً بے محل ہے کہ جبکہ قرآن عزیز کی نصوص نے تمام کائنات پر آپؐ کی برتری کو ثابت کر دیا اور آپؐ کی سیرت نے زندہ شہادت بن کر ان نصوص کی تصدیق کر دی تو کسی بھی انسان کی "زندگی" یا "رفع آسمانی" یا اور کوئی "وجہِ فضیلت" اس کے مقابلہ میں نہیں لائی جا سکتی، اور ہر ایک حالت و صورت میں "فضلِ کُلّی" اُسی جامع کمالاتِ ہستی کو حاصل رہے گا۔

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر

اس مسئلہ کو ختم کرنے سے پہلے اب ایک بات باقی رہ جاتی ہے کہ سورۂ نساء کی مسطورہ بالا آیت میں "وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" کی کیا تفسیر ہے یعنی وہ کیا اشتباہ تھا جو یہودیوں پر طاری کر دیا گیا تو قرآن عزیز اس کا جواب اس مقام پر بھی اور آلِ عمران میں بھی ایک ہی دیتا ہے اور وہ "رفع الی السماء" ہے، آلِ عمران میں اس کو وعدہ کی شکل میں ظاہر کیا "وَرَافِعُكَ إِلَيَّ" اور نساء میں ایفاءِ وعدہ کی صورت میں یعنی "بَل رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ" جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ محاصرہ کے وقت جب منکرینِ حق گرفتاری کے لیے اندر گھسے تو وہاں عیسیٰ (علیہ السلام) کو نہ پایا، یہ دیکھا تو سخت حیران ہوئے اور کسی طرح اندازہ نہ لگا سکے کہ صورتِ حال کیا پیش آئی اور اس طرح "وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" کا مصداق بنکر رہ گئے اس کے بعد قرآن کہتا ہے "إِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا" تو یہ اشتباہ کے بعد جو صورتِ حال پیش آئی اُس کا نقشہ بیان کیا گیا ہے اور اس سے دو باتیں بصراحت ظاہر ہوتی ہیں: ایک یہ کہ یہود اس سلسلہ میں اس طرح شک میں پڑ گئے تھے کہ گمان اور اٹکل کے ماسوا ان کے پاس علم و یقین کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی اور دوسری بات یہ کہ انھوں نے کسی کو قتل کر کے یہ مشہور کیا کہ انھوں نے "مسیح علیہ السلام" کو قتل کر دیا، ریا پھر آیت زمانۂ نبوتِ محمدی کے یہود کا حال بیان کر رہی ہے۔

پس قرآن عزیز کے اُن واضح اعلانات کے بعد جو حضرت مسیحؑ کی حفاظت وصیانت کے سلسلہ میں کیے گئے ہیں اور جن کو تفصیل کے ساتھ سطورِ بالا میں بیان کر دیا گیا ہے ان دونوں باتوں کی جزئی تفصیلات کا تعلق آثارِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) اور تاریخی روایات پر رہ جاتا ہے اور اس سلسلہ میں صرف ان ہی روایات و آثار کو قابلِ تسلیم سمجھا جائے گا جو اپنی صحتِ روایت کے ساتھ ساتھ ان بنیادی تصریحات سے نہ ٹکراتی ہوں جن کا ذکر متعدد مقامات پر قرآن عزیز نے بصراحت کر دیا ہے اور "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی خود ہی تفسیر کر دیتا ہے" کے اصول پر جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو دشمن ہاتھ تک نہ لگا سکے اور وہ محفوظ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیے گئے اور جیسا کہ حیوٰۃِ عیسیٰؑ کی بحث میں ابھی نصوصِ قرآنی سے ثابت ہوگا کہ وہ وقوعِ قیامت کے لیے "نشان" ہیں۔ اور اس لیے دوبارہ کائناتِ ارضی میں واپس آکر اور مفوضہ خدمت انجام دے کر پھر موت سے دوچار ہوں گے۔

شخصِ مقتول و مصلوب سے متعلق آثار و تاریخ کی جو ملی جلی روایات ہیں اُن کا حاصل یہ ہے کہ "سبت کی شب" میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بیت المقدس کے ایک بند مکان میں اپنے حواریوں کے ساتھ موجود تھے کہ بنی اسرائیل کی سازش سے دمشق کے بُت پرست بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے لیے ایک دستہ بھیجا اُس نے آکر محاصرہ کر لیا۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا۔ جب سپاہی اندر داخل ہوئے تو انھوں نے حواریوں میں ایک ہی شخص کو حضرت عیسیٰؑ کے ہم شبیہ پایا۔ اور اس کو گرفتار کر کے لے گئے اور پھر اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ ان ہی روایات میں بعض اس کا نام یودس بن کریا یوطا بیان کرتے ہیں اور بعض جرجس اور دوسرے داؤد بن لوزا کہتے ہیں۔

پھر ان روایات میں سے بعض میں ہے کہ یہ شخص مقتول اپنی خلقت ہی میں حضرت مسیحؑ

کا مشابہ اور اُن کا نقشِ ثانی تھا۔ اسرائیلیاتِ انجیلی میں ہے کہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواریوں میں سے یہودا اسخریوطی حضرتِ عیسیٰؑ کا شبیہ تھا اور بعض روایات میں ہے کہ جب یہ نازک گھڑی آپہنچی تو حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے حواریوں کو دعوت و تبلیغِ حق سے متعلق تلقین و ہدایات کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھ کو مطلع کر دیا ہے کہ میں ایک مدت تک کے لیے ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جاؤں گا اور یہ واقعہ مخالفین اور متبعین دونوں کے لیے سخت آزمائش و امتحان میں جانے والا ہے لہٰذا تم میں سے جو شخص اس پر آمادہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو میرا شبیہ بنا دے اور وہ خدا کی راہ میں جامِ شہادت پیے اس کو جنت کی بشارت ہے، تب ایک حواری نے پہل کی اور خود کو اس کے لیے پیش کیا اور منجانب اللہ وہ حضرتؑ کا ہم شکل ہو گیا اور سپاہیوں نے اس کو گرفتار کر لیا۔[1]

یہ تفصیلات نہ قرآن میں مذکور ہیں اور نہ احادیثِ مرفوعہ میں اس لیے وہ صحیح ہوں یا خلافِ نفسِ مسئلہ اپنی جگہ اٹل ہے اور قرآن کی آیات میں منصوص، اس لیے اصحابِ ذوق کو اختیار ہے کہ وہ صرف قرآن کے اس اجمال پر ہی قناعت کریں کہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کا رفع الی السماء اور ہر طرح دشمنوں سے تحفظ نیز یہود پر معاملہ کا مشتبہ ہو کر کسی دوسرے کو قتل کرنا، یہود و نصاریٰ کے پاس اس سلسلہ میں علم و یقین سے محروم ہو کر ظن و تخمین اور شک و شبہ میں مبتلا ہو جانا اور قرآن کا حقیقتِ واقعہ کو علم و یقین کی روشنی میں ظاہر کر دینا یہ سب حقائق ثابتہ ہیں "وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" اور "إِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ" (الآیہ) کی تفسیر میں ان روایات کی تفصیلات کو بھی قبول کر لیں اور یہ سمجھ کر تسلیم کریں کہ زیرِ بحث آیات کی تفسیر ان تفصیلات پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ امر زائد ہے جو آیات کی تفسیرِ صحیح کے لیے مؤید ہے۔

حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام | سورۂ آلِ عمران، مائدہ اور نساء کی زیرِ بحث آیات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق حکمتِ الٰہی کا یہ فیصلہ اٹل تھا کہ ان کو بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جائے اور وہ دشمنوں اور کافروں سے محفوظ اٹھا لیے جائے۔

[1] واقعات کی یہ تفصیلات تاریخ ابن کثیر جلد ۲ اور کتبِ تفسیر میں منقول ہیں۔۱۲

لیکن قرآن نے اس مسئلہ میں صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حسب موقع اُن کی حیاتِ امروز پر نصوصِ قطعیہ کے ذریعہ متعدد جگہ روشنی ڈالی ہے اور ان مقامات میں اس جانب بھی اشارات کیے ہیں کہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی حیاتِ طویل اور رفع الی السماء میں کیا حکمت مستور تھی تاکہ اہلِ حق کے قلوب تازگیِ ایمان سے شگفتہ ہوجائیں اور باطل کوش اپنی کورباطنی پر شرمائیں۔

لیؤمنن بہ قبل موتہ	وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ (نساء پ ۶)	اور کوئی اہلِ کتاب میں سے باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ وہ ضرور ایمان لائے گا عیسیٰؑ پر اُس (عیسیٰؑ) کی موت سے پہلے اور وہ (عیسیٰؑ) قیامت کے دن ان پر (اہلِ کتاب پر) گواہ بنے گا۔

اِس آیت سے قبل آیات میں وہی مسطورۂ بالا واقعہ مذکور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ صلیب پر چڑھایا گیا اور نہ قتل کیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب اٹھالیا یہود و نصاریٰ کے اس عقیدہ کی تردید ہے جو انھوں نے اپنے باطل زعم اور اُکل سے قائم کرلیا تھا، ان سے کہا جارہا ہے کہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے متعلق صلیب پر چڑھائے جانے اور قتل کیے جانے کا دعویٰ قابلِ لعنت ہے کیونکہ بہتان اور لعنت توام ہیں اس کے بعد اس آیت میں امرِ اوّل کی تصدیق میں اس جانب توجہ دلائی جارہی ہے کہ آج اگر اس ملعون عقیدہ پر فخر کررہے ہو تو وہ وقت بھی آنے والا ہے جب عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) خدائے برتر کی حکمت و مصلحت کو پُورا کرنے کے لیے کائناتِ ارضی پر واپس تشریف لائیں گے اور اس عینی مشاہدہ کے وقت اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے ہر ایک موجود ہستی کو قرآن کے فیصلہ کے مطابق عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لے آنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے گا۔ اور پھر جب وہ اپنی مدتِ حیات ختم کرکے موت کی آغوش سے دوچار ہوجائیں گے تو قیامت کے دن اپنی اُمت (اہلِ کتاب) پر اُسی طرح گواہ ہوں گے جس طرح تمام انبیاء و مرسلین

اپنی اپنی اُمتوں پر شاہد بنیں گے۔

یہ حقیقت کچھ مخفی نہیں ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں واقعۂ صلیب و قتل پر متفق ہیں لیکن اس سلسلہ میں دونوں کے عقائد کی بُنیاد قطعاً متضاد اصول پر قائم ہے، یہود، حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کو "شریر اور کاذب" کہتے اور "دجّال" سمجھتے ہیں اور اس لیے فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے یسوع مسیح کو صلیب پر بھی چڑھایا اور پھر اس حالت میں مارا بھی ڈالا۔ اس کے برعکس نصاریٰ کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کا پہلا انسان آدم (علیہ السلام) گنہگار تھا اور ساری دنیا گنہگار تھی اس لیے خدا کی صفتِ رحمت نے ارادہ کیا کہ دُنیا کو گناہوں سے نجات دلائے اس لیے اُس کی صفتِ "رحمت" نے ابنیت (بیٹا ہونا) کی شکل اختیار کی اور اس کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ یہود کے ہاتھوں سولی پر چڑھے اور مارا جائے اور اس طرح ساری کائناتِ ماضی و مستقبل کے گناہوں کا "کفارہ" بن کر دُنیا کی نجات کا باعث بنے۔

سورۂ نساء کی آیات میں قرآن عزیز نے صاف صاف کہہ دیا کہ حضرتِ مسیح کے قتل کے دعویٰ کی بُنیاد کسی بھی عقیدہ پر مبنی ہو لائقِ لعنت اور باعثِ ذلت و خسران ہے۔ خدا کے سچے پیغمبر کو مفتری سمجھ کر یہ عقیدہ رکھنا بھی لعنت کا موجب اور خدا کے بندے اور مریمؑ کے بطن سے پیدا انسان کو خدا کا بیٹا بنا کر اور "کفارہ" کا باطل عقیدہ تراش کر مسیح (علیہ السلام) کو مصلوب و مقتول تسلیم کرنا بھی گمراہی اور علم و حقیقت کے خلاف اُٹکل کا تیر ہے اور اس سلسلہ میں صحیح اور مبنی بر حقیقت فیصلہ وہی ہے جو قرآن نے کیا ہے اور جس کی بنیاد "علم و یقین اور وحیِ الٰہی" پر قائم ہے۔

پس آج جبکہ تمہارے سامنے اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے جو شک و ظن کی شکستہ بنیادوں پر قائم تھا علم و یقین کی روشنی آچکی ہے پھر بھی تم اپنے ظنونِ کاسدہ اور اوہامِ فاسدہ پر اصرار کر رہے ہو اور حضرتِ مسیح سے متعلق باطل عقیدہ کو ترک کرنے کے لیے تیار

۹

لہ دجّال دجل سے ماخوذ ہے جس کے معنی "فریب" ہیں۔

نہیں ہوتے ہو تو قرآن کا ایک دوسرا فیصلہ اور وحی الٰہی کا یہ اعلان بھی سن لو کہ تمہاری نسل پر وہ وقت بھی آنے والا ہے جب قرآن کے اس صحیح فیصلہ اور اعلانِ حق کے مطابق حضرتِ مسیح ملاءِ اعلیٰ سے کائناتِ ارضی کو واپس ہوں گے اور ان کی یہ آمد ایسی مشاہد ہوگی کہ یہود و نصاریٰ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ رہے گا جو بادلِ خواستہ یا بادلِ ناخواستہ اُس ذاتِ گرامی پر یہ ایمان نہ لے آئے کہ بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں، خدا کے بیٹے نہیں، برگزیدہ انسان ہیں، مصلوب و مقتول نہیں ہوئے تھے، بقیدِ حیات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں: "وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ"۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران اور سورۂ مائدہ کی طرح اس جگہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے لیے لفظ "توفی" نہیں بولا گیا بلکہ بصراحت لفظ "موت" استعمال کیا گیا ہے، یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ان دونوں مقامات پر جس حقیقت کا اظہار مقصود ہے اُس کے لیے "توفی" ہی مناسب ہے جیسا کہ سورۂ آلِ عمران سے متعلق آیات کی تشریح و تفسیر میں گذر چکا اور سورۂ مائدہ سے متعلق آیت کی تفسیر میں عنقریب بیان ہوگا اور اس جگہ چونکہ براہِ راست "موت" ہی کا تذکرہ مطلوب ہے اور اس حالت کا ذکر ہے جس کے بعد حضرتِ مسیح (علیہ السلام) بھی "كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ" کا مصداق بننے والے ہیں اس لیے یہاں "موت" کو بصراحت لانا ہی ازبس ضروری تھا اور یہ مزید بُرہان ہے اس دعویٰ کے لیے کہ آلِ عمران اور مائدہ میں لفظ "موت" کی جگہ "توفی" کا اطلاق بلاشبہ خاص مقصد رکھتا ہے ورنہ جس طرح ان دونوں مقامات پر توفی کا اطلاق کیا گیا تھا اسی طرح یہاں بھی کیا جاتا یا جس طرح اس جگہ لفظ "موت" کا اطلاق کیا گیا ہے اسی طرح ان دونوں مقامات پر بھی لفظِ موت ہی کا استعمال ہونا چاہیے تھا مگر قرآن عزیز کے ان دقیق اسالیبِ بیان کے فرق کا فہم طالبینِ حق کا ہی حصہ ہے نہ کہ مرزائے کادیانی اور مسٹر لاہوری جیسے اصحابِ زیغ کا جو اپنی خاص اغراضِ ذاتی کے پیشِ نظر پہلے ایک نظریہ

ایجاد کر لیتے ہیں اور بعد ازاں اس سلسلہ کی تمام آیاتِ قرآنی کو اسی کے سانچہ میں ڈھال کر اس کا نام "تفسیرِ قرآن" رکھتے ہیں۔

بہرحال جمہور کے نزدیک آیت زیرِ عنوان کی تفسیر یہی ہے جو سپردِ قلم کی جا چکی، مشہور محدث، جلیل القدر مفسر اور اسلامی مؤرخ، عماد الدین بن کثیر (رحمہ اللہ) اس تفسیر کو حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) اور حسن بصری (رحمہ اللہ) سے بسندِ صحیح نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

قتادہ، عبدالرحمٰن اور بہت سے مفسروں کا یہی قول ہے اور یہی قولِ حق ہے جیسا کہ عنقریب ہم دلیلِ قاطع سے اس کو ثابت کریں گے۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)[1]

اور سرتاجِ محدثین ابن حجر عسقلانی (رحمہ اللہ) بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اسی تفسیر پر حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) نے یقین کیا ہے اور ابن عباسؓ کی اس تفسیر کو ابن جریر نے بروایتِ سعید بن جبیر اور ابو رجاء نے بھی حسنؒ سے بسندِ صحیح روایت کیا ہے کہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا "قبل موتہ" یعنی قبلِ موتِ عیسیٰ (علیہ السلام) قسم بخدا بیشک و شبہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بقیدِ حیات ہیں اور جب وہ آسمان سے اتریں گے تو سب اہلِ کتاب اُن پر ایمان لے آئیں گے اور ابن جریر (رحمہ اللہ) نے اسی تفسیر کو اکثر اہلِ علم سے نقل کیا ہے اور ابن جریرؒ وغیرہ نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے"[2]

مگر اس صحیح تفسیر کے علاوہ کتبِ تفسیر میں احتمالِ عقلی کے طور پر دو قول اور بھی منقول ہیں مگر وہ دونوں بلحاظِ سند ضعیف اور ناقابلِ اعتماد اور بلحاظِ سیاق و سباق (یعنی آیت زیرِ بحث سے قبل اور بعد کی آیات کے لحاظ سے) غلط اور ناقابلِ التفات ہیں یعنی ایسے احتمالاتِ عقلی ہیں جو نقل اور آیات کے باہمی نظم و ترتیب کے خلاف ہیں۔

اِن ہر دو معنی میں سے ایک معنی یہ ہیں کہ "موتہ" میں جو ضمیر ہے اس کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بجائے اہلِ کتاب کی جانب لوٹایا جائے اور آیت کا ترجمہ یوں کیا جائے

[1] ابن کثیر جلد اول۔ [2] فتح الباری شرح بخاری ج ۶ ص ۳۰۴۔

"اور اہلِ کتاب میں سے کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے عیسیٰؑ پر ایمان نہ لے آتا ہو" یعنی اگرچہ یہود و نصاریٰ اپنی زندگی میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق قرآن کے بتائے ہوئے عقیدے پر ایمان نہیں لاتے اور اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہیں لیکن جب ان کو "موت" آ دباتی ہے تو وہ اس آخری حالت میں "جو نزع کا وقت کہلاتا ہے" صحیح عقیدہ کے مطابق ایمان لے آتے ہیں اور اہلِ کتاب کے ہر ایک فرد پر بلا استثناء یہی حالت گذرتی ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ "اہلِ کتاب کا ہر ایک فرد اپنی موت سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتا ہے" یعنی جب وہ عالمِ دنیا سے منقطع ہو کر عالمِ غیب سے وابستہ ہو رہا ہوتا ہے اس وقت اس پر اصل حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیشک خدا کے سچے پیغمبر تھے۔

پس اس بات سے قطع نظر کہ یہ دونوں تفسیریں نقلِ روایت کے اعتبار سے ناقابلِ اعتماد اور غیر صحیح اور آیات کے سیاق و سباق کے خلاف ہیں عقلی نقطۂ نظر سے بھی غلط ہیں اس لیے کہ اگر آیت کے معنی یہ ہیں جو سطورِ بالا میں نقل کیے گئے تب یہ آیت اپنے مقصدِ بیان کے خلاف بے معنیٰ اور بے نتیجہ ہو جاتی ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ قرآن عزیز دوسرے مقامات پر صاف کہہ چکا ہے کہ جب انسان عالمِ دنیا سے کٹ کر عالمِ غیب سے وابستہ ہو جاتا ہے اور نزع کی یہ کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے کہ جو معاملات اس ساعت سے قبل تک اس کے لیے غیب کے معاملات تھے وہ مشاہدہ میں آنے شروع ہو جاتے ہیں تو اس وقت اس کے اعمال و کردار کا صحیفہ لپیٹ دیا جاتا ہے اور اب تبدیلیِ اعتقاد کا کوئی نتیجہ اور ثمرہ نہیں ملتا یعنی اس وقت کا نہ اقرار و اعتراف معتبر اور نہ انکار مستند :-

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ	پس جب آئے ان کے پاس پیغمبر واضح دلائل لیکر تو اُس چیز
بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ	سے خوش ہوئے جو ان کے پاس علم سے تھی اور گھیر لیا ان کو اُس چیز
الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ	نے جس کی وہ مذاق بناتے تھے پس جب انھوں نے ہمارا عذاب

يَسْتَهْزِءُوْنَ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا
قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا
بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ
يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا
سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ
عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝

دیکھا تو انھوں نے کہا ہم خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور جن چیزوں کو ہم اس کا شریک بناتے تھے اس سے منکر ہوئے، پس نہیں نافع ہوا اُن کا (یہ) ایمان جب انھوں نے ہمارے عذاب کا مشاہدہ کر لیا، یہ اللہ کی سنت ہے جو اُس کے بندوں میں ہمیشہ جاری رہی اور اس موقع پر کافروں نے زیان پایا۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ
يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا
حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ
اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ
يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ
اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

(سورۂ نساء پ ۴ ع ۳)

لیکن اُن لوگوں کی توبہ توبہ نہیں ہے جو (ساری عمر) بُرائیاں کرتے رہے لیکن جب ان میں سے کسی کے آگے موت آکھڑی ہوئی تو کہنے لگا اب میں توبہ کرتا ہوں، (ظاہر ہے کہ ایسی توبہ سچی توبہ نہیں ہوتی) اسی طرح اُن لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے جو دنیا سے کُفر کی حالت میں جاتے ہیں، ان تمام لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تو ایسی صورت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟ انسان جب اس حالت پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے سامنے سے غیب کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور برزخ، ملائکۃ اللہ، عذاب یا راحت، جنت و جہنم، غرض دینِ حق کی تعلیم کردہ غیب کی ساری حقیقتیں اس پر منکشف ہو جاتی ہیں اور اس میں یہود و نصاریٰ کی ہی خصوصیت کیا ہے، یہ حالت تو ہر ایک ابنِ آدم پر گذرنے والی ہے، نیز جب اِس قسم کا ایمان قبول ہی نہیں ہے تو اس کا ذکر اسی اسلوب کے ساتھ ہونا چاہیے تھا جو غرقِ فرعون کے وقت فرعون کے ایمانی اعتراف و اقرار کے لیے اختیار کیا گیا اور جس میں اس وقت کی ایمانی پکار کی بے وقعتی ظاہر کی گئی ہے نہ کہ ایسے اسلوبِ بیان کے ساتھ

لہ سورۃ المؤمن پ ۲۴ ع ۹۔

گویا مستقبل میں ہونے والے کسی ایسے عظیم الشان واقعہ کی خبر دی جارہی ہے جو مخاطبین (یہود و نصاریٰ) کے عقائد و عزائم کے خلاف حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق قرآن کی تصدیق اور اس کے اٹل فیصلہ کی زندہ شہادت بن کر پیش آنے والا ہے ورنہ تو ایک عیسائی اور یہودی پنجۂ موت میں آجانے کے وقت جانِ عزیز سپرد کر دینے سے پہلے حضرتِ عیسیٰؑ پر ایمان لایا تب کیا اور نہ لایا تب کیا اس کی یہ تصدیق کائناتِ انسانی کے علم و ادراک سے باہر صرف اس کے اور خدا کے درمیان تعلق رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی بات کا ایسے موقع پر تذکرہ کرنا قطعاً بے محل ہے جہاں ایک قوم کو اس کے ایک خاص عقیدہ پر ملزم و مجرم بنانے کے لیے فیصلۂ حق کی تائید کے لیے ماضی اور مستقبل میں کائناتِ ارضی پر پیش آنے والے واقعات کو پیش کیا جارہا ہے جیسا کہ آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہو رہا ہے علاوہ ازیں ان احتمالات کی یہاں اس لیے بھی گنجائش نہیں ہے کہ غزوہ کے وقت حضرتِ عیسیٰؑ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس قسم کا ایمان تو ہر اُس اہلِ کتاب سے متعلق ہے جو اس آیت کے نزول سے کچھ دن قبل یا صدیوں قبل گذر چکے اور مرکھپ چکے ہیں لہٰذا اگر آیت میں یہ مضمون بیان کرنا مقصود تھا تو اس کے لیے مؤکد مستقبل کی یہ تعبیر "لیومنن" فصاحت و بلاغتِ کلام کے بالکل خلاف ہے اس کیلیے تو ایسی تعبیر کی ضرورت تھی [illegible] ال اور استقبال تینوں زمانوں پر حاوی ہوتی تاکہ قرآن کا مفہوم اپنے توسع کے لحاظ سے پوری طرح ادا ہوتا۔

نیز دوسرے معنی تو اس لیے بھی قطعاً غلط اور بے محل ہیں کہ اس آیت سے قبل اور بعد کی آیات میں یعنی سیاق و سباق میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہی نہیں ہے کیوں کہ شروع آیات میں صرف حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کا ذکر ہو رہا ہے اور اس آیت کے آخر میں یہ ارشاد ہوا ہے: "وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا" اور واضح ہے یہ بات کہ اس جگہ شاہد سے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) مراد ہیں اور عَلَيْهِمْ کی ضمیر سے ان کی اُمت تو پھر نبیِ اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیے بغیر درمیان کی کسی ضمیر کا مرجع ذاتِ اقدس کو قرار دینا نہ صرف یہ کہ فصاحت و بلاغت کے منافی ہے بلکہ قاعدۂ عربیت کے قطعاً خلاف اور انتشارِ ضمائر کا موجب ہے، غرض بے غل و غش صحیح معنی وہی ہیں جو جمہور نے اختیار کیے ہیں اور یہ دونوں خود ساختہ احتمالات آیت کی تفسیر تو کیا صحیح احتمال کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں[1]

حیوٰۃ و نزولِ عیسٰی علیہ السلام اور احادیثِ صحیحہ

قرآن عزیز نے جس معجزانہ اختصار کے ساتھ حضرت عیسٰی (علیہ السلام) کے رفعِ سماوی، حیاتِ امروز اور علامتِ قیامت بن کر نزولِ من السماء کے متعلق تصریحات کی ہیں صحیح ذخیرۂ احادیثِ نبوی میں ان آیات ہی کی تفصیلات بیان کر کے ان حقائق کو روشن کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام حدیث بخاری اور مسلم نے صحیحین (صحیح بخاری، صحیح مسلم) میں حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے یہ روایت متعدد طریقہائے سند سے نقل کی ہے:۔

قال رسول اللہ صلے اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اُس ذات کی قسم جس کے
علیہ وسلم والذی نفسی بیدہٖ	قبضہ میں میری جان ہے ضرور وہ وقت آنے والا ہے کہ تم میں عیسٰی
لیوشکن ان ینزل فیکم ابن	بن مریم حاکم و عادل بن کر اُتریں گے وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو
مریم حکماً عدلاً فیکسر الصلیب	قتل کریں گے (یعنی موجودہ عیسائیت کو مٹائیں گے) اور جزیہ اُٹھا دیں گے
ویقتل الخنزیر ویضع الجزیۃ	(یعنی نشانِ الٰہی کے مشاہدہ کے بعد اسلام کے سوا کچھ بھی قبول نہیں ہوگا
ویفیض المال حتی لا یقبلہ	اور اسلامی احکام میں بارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جزیہ کا حکم اسی وقت

---

[1] اس مقام کے علاوہ سورۂ زخرف کی آیت وَمَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ اور سورۂ آلِ عمران کی ابتداء سے بیاسی آیات تک جو وفد نجران سے تعلق رکھتی ہیں یہ سب مقاماتِ لالۃ النص یا اشارۃ النص کی شکل میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی حیات کے لیے دلیل و برہان ہیں اور اگرچہ ان کی تفصیلات اور وجوہِ استشہاد میرے پاس مدون و مرتب ہیں تاہم کتاب کی طوالت کے خوف سے اس جگہ ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے بوقتِ فرصت انشاء اللہ مستقل مضمون کی صورت میں ہدیۂ ناظرین ہوگا، اور یا پھر حجۃ الاسلام علامہ محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ کی کتاب "عقیدۃ الاسلام فی حیوٰۃ عیسٰی علیہ السلام" اس مقصد کے لیے قابلِ مراجعت ہے۔

احد وحتی تکون السجدۃ الواحدۃ تک کے لیے ہے) اور مال کی اس درجہ کثرت ہوگی کہ کوئی اس کو قبول
خیرا من الدنیا وما فیھا کرنے والا نہیں ملے گا اور خدا کے سامنے ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے
ثم قال ابوھریرۃ اقرؤا ان زیادہ قیمت رکھے گا (یعنی مالی کثرت کی وجہ سے خیرات و صدقات کے
شئتم (وان من اھل مقابلہ میں عبادتِ نافلہ کی اہمیت بڑھ جائے گی) پھر ابوہریرہؓ نے فرمایا اگر
الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل تم (قرآن سے اس کا استشہاد) چاہو تو یہ آیت پڑھو (وان من
موتہ ویوم القیمۃ یکون اھل الکتاب - الآیہ) اور کوئی اہلِ کتاب میں سے نہ ہوگا مگر (عیسیٰ کی)
علیھم شھیدا) موت سے پہلے اس پر (عیسیٰؑ پر) ضرور ایمان لے آئیگا اور وہ (عیسیٰؑ)
(کتاب الانبیاء) قیامت کے دن اُن پر گواہ ہوگا۔

(۲) بخاری اور مسلم میں بسندِ نافع مولی ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ حضرتِ ابوہریرہؓ سے یہ روایت بھی منقول ہے:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب
علیہ وسلم کیف انتم اذا نزل ابن تم میں ابن مریم اتریں گے اور اس حالت میں اتریں گے کہ تم ہی میں سے
مریم فیکم وامامکم منکم ایک شخص تمہاری امامت کر رہا ہوگا۔

اِن دونوں روایات کے علاوہ حضرتِ ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے متعدد طریقہائے سند سے اور روایات بھی صحیحین: مسند احمد اور سنن[1] میں درج ہیں جو یہی مفہوم و معنی ادا کرتی ہیں، اُن میں سے ایک زیادہ مفصل ہے اور مسئلۂ زیرِ بحث کے بعض دوسرے پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ مسندِ احمد میں ہے:۔

(۳) ان النبی صلی اللہ علیہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمام انبیاء اصولِ دین میں علاتی
وسلم قال الانبیاء اخوۃ بھائیوں کی طرح ہیں، دین سب کا ایک اور فروعِ دین مختلف اور
لعلات امھاتھم شتی ودینھم میں دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں عیسیٰؑ بن مریم سے زیادہ قریب ہوں
واحد وانا اولی الناس بعیسی اس لیے کہ ان کے اور میرے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا اور

[1] کتاب الانبیاء - [1] ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ۔

بن مریم لانه لم یکن نبی بینی وبینه وانه نازل فاذا رأیتموه فاعرفوه رجل مربوع الی الحمرة والبیاض علیه ثوبان ممصران کان رأسه یقطر وان لم یصبه بلل، فیدق الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیة ویدع الناس الی الاسلام ویهلك الله فی زمانه المسیح الدجال ثم تقع الامنة علی الارض حتی ترتع الاسود مع الابل والنمار مع البقر والذئاب مع الغنم ویلعب الصبیان بالحیات لا تضرهم فیمکث اربعین سنة ثم یتوفی ویصلی علیه المسلمون

بلاشبہ وہ کائناتِ ارضی پر اتریں گے پس جب تم اُن کو دیکھو تو اس حلیہ سے پہچان لینا، میانہ قد، سرخ و سپید رنگ ہوگا ان کے جسم پر دو سُرخی مائل رنگ کی چادریں ہوں گی ایسا معلوم ہوگا گویا فی الحال غسل کرکے آرہے ہیں اور سر سے پانی کے قطرے موتی کی طرح ٹپک پڑنے والے ہیں۔ وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے (موجودہ عیسائیت کا خاتمہ کردیں گے) اور جزیہ اُٹھادیں گے اور لوگوں کو "اسلام" کی دعوت دیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے زمانہ میں تمام ادیان و ملل کو مٹادے گا اور صرف ایک ہی دین "دینِ اسلام" باقی رہ جائے گا اور اللہ تعالیٰ ان ہی کے زمانہ میں مسیح دجال کو ہلاک کرے گا پھر کائنات میں "امانت" (امرِ خیر) جگہ کرلے گی حتیٰ کہ شیر اونٹوں کے ساتھ، چیتے گائے بیلوں کے ساتھ، بھیڑیے بکریوں کے ساتھ چرتے نظر آئیں گے اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے، اور اُن کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا، پس عیسیٰؑ چالیس سال اس زمین پر زندہ رہیں گے پھر وفات پاجائیں گے اور مُسلمان اُن کے جنازہ کی نماز ادا کریں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرتِ ابوہریرہؓ سے ایک طویل حدیث روایت کی گئی ہے اس میں خروجِ دجال کا ذکر کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ مبارک مذکور ہے:۔

(۴) فاذا جاء الشام خرج فبینما یعدون للقتال یسوون الصفوف اذا اقیمت الصلوٰة فینزل عیسی بن مریم الخ

پس جب مسلمان ملک شام پہنچیں گے تو دجال کا خروج ہوگا ابھی مسلمان اس کے مقابلہ میں جنگ کی تیاریاں کررہے ہوں گے صفیں درست کرتے ہونگے کہ نماز کے لیے اقامت ہونے لگے گی۔ اس درمیان میں عیسیٰ بن مریمؑ کا نزول ہوگا اور وہ مُسلمانوں کی امامت کا فرض انجام دیں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت نواس بن سمعان (رضی اللہ عنہ) سے ایک طویل روایت منقول ہے جس میں یہ مذکور ہے :۔

اذا بعث اللہ المسیح	(ابھی دجال ایک سلطان پر اپنے شیطانی کرشموں کی آزمائش کر ہی رہا ہوگا
بن مریم (علیہ السلام)	کہ اللہ تعالیٰ مسیح بن مریمؑ کو بھیج دے گا وہ جب کائناتِ ارضی پر
فینزل عند المنارۃ البیضاء	اُتریں گے تو مسجد دمشق کے مشرقی جانب کے سپید منارہ پر اُتریں گے
شرقی دمشق بین مھرودتین	اور ان کے بدن پر (سرخی مائل) گہری زرد رنگ کی دو چادریں
واضعا کفیہ علی اجنحۃ	ہوں گی (یعنی ایک بدن کے اوپر کے حصہ پر اور دوسری زیریں
ملکین اذا طأطأ	حصۂ بدن پر لپیٹی ہوگی) اور دو فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا لیے
رأسہ قطر واذا رفعہ	ہوں گے۔ جب سر جھکائیں گے تو سر سے پانی ٹپک پڑنے لگے گا
تحدر منہ حمانٌ	اور جب سر اُٹھائیں گے تو پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمکیں گے
کاللؤلؤ الخ۔	(یعنی غسل کیے آرہے ہوں گے)

اور مختلف طریقہائے سند سے امام احمد نے مسند میں اور ترمذی (رحمہ اللہ) نے سنن میں حضرت مجمع بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) سے بسندِ صحیح یہ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے :۔

یقتل ابن مریم الدجال بباب لُدّ[1] ابن مریم، دجال کو باب لد پر قتل کریں گے۔

امام ترمذی اس روایت کو نقل کرکے فرماتے ہیں "ھٰذا حدیث صحیح" اور اس کے بعد اُن حضراتِ صحابہؓ کی فہرست شمار کراتے ہیں جن سے نزولِ عیسیٰ بن مریم اور ان کے ہاتھوں قتلِ دجال سے متعلق روایات کتبِ حدیث میں منقول ہیں فرماتے ہیں :۔

اور اس باب میں حضرت عمران بن حصین، نافع بن عیینہ، ابو برزہ اسلمی، حذیفہ بن اسید، ابو ہریرہ، کیسان، عثمان بن العاص، جابر بن عبداللہ، ابو امامہ باہلی، ابن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص، سمرۃ بن جندب، نواس بن سمعان، عمرو بن عوف، حذیفہ بن الیمان

[1] شہر دمشق کی شہر پناہ کا ایک دروازہ ہے۔

(رضی اللہ عنہم) سے بھی روایات منقول ہیں[1]۔

اور امام احمدؒ نے مسند میں، امام مسلمؒ نے صحیح میں اور اصحابِ سنن نے سنن میں، بروایتِ حضرتِ حذیفہ بن الاسیدی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے:-

قال اشرف علینا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من غرفۃ ونحن نتذاکر الساعۃ فقال: لا تقوم الساعۃ حتی تروا عشر ایات، طلوع الشمس من مغربھا والدخان والدابۃ، وخروج یاجوج وماجوج ونزول عیسی بن مریم والدجال وثلثۃ خسوف خسف بالمشرق وخسف بالمغرب وخسف بجزیرۃ العرب ونار تخرج من قعر عدن تسوق وتحشر الناس تبیت معھم حیث باتوا وتقیل معھم حیث قالوا[2]۔	حضرتِ حذیفہ فرماتے ہیں ہم (صحابہ) ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے قیامت کے متعلق بات چیت کر رہے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالاخانہ سے جھانکا اور ارشاد فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم دس نشان نہ دیکھ لوگے۔ آفتاب کا مغرب سے طلوع، دخان (دھواں) دابۃ الارض، خروجِ یاجوج وماجوج، عیسیٰ بن مریم کا نزول دجال کا خروج، تین مقامات میں خسوف کا پیش آنا۔ (زمین میں دھنس جانا) مشرق میں مغرب میں اور جزیرۃ العرب میں، آگ کا قعرِ عدن سے نکلنا جو لوگوں کو سمیٹ لے جائے گی اور جب رات کو لوگ آرام کریں گے تو وہ بھی ٹھہر جائے گی اور جب دوپہر کو قیلولہ کریں گے تب بھی وہ ٹھیری رہے گی۔

اور محدث ابن ابی حاتمؒ نے اور جلیل القدر محدث ومفسر ابن جریر طبریؒ نے بروایتِ حسن بصری (رحمہ اللہ) بسندِ صحیح حیات ونزولِ عیسیٰ بن مریم سے متعلق ایک روایت نقل کی ہے اس میں ہے:-

---

[1] ترمذی باب نزولِ عیسیٰ بن مریمؑ۔ [2] اس حدیث میں جن علامات کا ذکر ہے وہ سب تشریح طلب ہیں مگر یہاں ان کی تشریحات بے محل ہیں اس لیے نظر انداز کر دی گئیں، عام تشریحات کتب تفسیر وحدیث میں اور شاہ رفیع الدین دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کے رسالہ علاماتِ قیامت میں قابلِ مطالعہ ہیں۔

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے فرمایا: عیسیٰ
لليهود ان عيسىٰ لم يمت وانه	(علیہ السلام) مرے نہیں اور بلاشبہ وہ قیامت سے
راجعٌ اليكم قبل يوم القيٰمة	پہلے تمہاری جانب لوٹ کر آئیں گے۔

اسی طرح ابن ابی حاتم اور ابن جریر (رحمہما اللہ) نے سورۂ نساء کی آیات متعلقہ وفدِ نجران کی تفسیر کرتے ہوئے اصولِ حدیث کے نقطۂ نظر سے بہ سندِ حسن ایک طویل روایت ربیع بن انسؒ سے نقل کی ہے اس میں بھی بصراحت یہ مذکور ہے:-

فقال لهم النبي صلى الله عليه	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد سے فرمایا: کیا تم
وسلم الستم تعلمون ان ربنا	نہیں جانتے کہ بلاشبہ ہمارا پروردگار زندہ ہے جس
حيٌّ لا يموت وان عيسىٰ يأتي	کے لیے موت نہیں ہے اور بلاشبہ عیسیٰ السلام کو
عليه الفناء[1]	فنا (موت) سے دوچار ہونا ہوگا۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس جگہ لفظ "یأتی" فرمایا ہے جو مستقبل کے لیے بولا جاتا ہے لفظ "اتیٰ" نہیں فرمایا جو ماضی کے لیے مخصوص ہے۔

اور بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں اور محدث علی متقی گجراتی نے کنز العمال میں باسنادِ حسن و صحیح اس سلسلہ میں جو روایات نقل فرمائی ہیں ان میں نزولِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے ذکر کے ساتھ "من السماء" کا لفظ صراحت سے موجود ہے۔[2]

یہ اور اسی قسم کا کثیر ذخیرۂ حدیث ہے جو حیات و نزولِ عیسیٰ بن مریم پیغمبرِ بنی اسرائیل (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے متعلق کتبِ حدیث و تفسیر میں منقول ہے اور جو قوتِ سند کے لحاظ سے صحیح اور حسن سے کم رتبہ نہیں رکھتا اور باعتبارِ شہرت و تواتر روایات جن کا یہ حال ہے کہ حسبِ تصریح امام ترمذی، حافظِ حدیث عماد الدین بن کثیر، حافظِ حدیث ابن حجر عسقلانی اور دیگر ائمہ حدیث سبعہ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو روایت کیا ہے جن میں سے

---

[1] تفسیر ابن جریر ج ۵۔ [2] کتاب الاسماء والصفات صفحہ ۳۰۱ و کنز العمال ج ۷، ص ۲۶۸۔

بعض صحابہ کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تصریحات سیکڑوں صحابہؓ کے مجمع میں خطبہ دے کر فرمائیں اور یہ صحابہ کرامؓ بغیر کسی انکار و اجنبیت کے ان روایات کو خلفاء راشدین (رضی اللہ عنہم) کے دورِ خلافت میں علیٰ رؤس الاشہاد سناتے تھے چنانچہ ان جلیل القدر صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے جن ہزارہا شاگردوں نے سنا ان میں سے یہ عظیم المرتبہ ہستیاں قابلِ ذکر ہیں جن میں ہر فرد روایتِ حدیث میں ضبط و حفظ، ثقاہت و علمی تبحر کے پیشِ نظر امامت و قیادت کا درجہ رکھتا ہے مثلاً سعید بن المسیب، نافع مولیٰ ابو قتادہ، حنظلہ بن علی الاسلمی، عبدالرحمٰن بن آدم، ابوسلمہ، ابوعمرہ، عطاء بن بشار، ابوسہیل، موثر بن غفارہ، یحییٰ بن ابی عمرو، جبیر بن نفیر، عروہ بن مسعود ثقفی، عبداللہ بن زید انصاری، ابوزرعہ، یعقوب بن عامر، ابونضرہ ابوالطفیل (رحمہم اللہ)

پھر ان علماء و کبار اور محدثینِ اعلام سے جن بے شمار تلامذہ نے سنا ان میں سے راویانِ حدیث کے طبقہ میں جن کو حدیث اور علومِ قرآن کا رتبۂ بلند حاصل ہے اور جو اپنے اپنے وقت کے "امام الحدیث" اور "امیر المومنین فی الحدیث" تسلیم کیے گئے ہیں بعض کے اسماءِ گرامی یہ ہیں:- ابن شہاب زہری، سفیان بن عیینہ، لیث، ابن ابی ذئب، اوزاعی، قتادہ، عبدالرحمٰن بن ابی عمرہ، سہیل، جبلہ بن سحیم، علی بن زید، ابورافع، عبدالرحمٰن بن جبیر، نعمان بن سالم، معمر، عبداللہ بن عبیداللہ (رحمہم اللہ)

غرض ان روایات و احادیثِ صحیحہ کا صحابہ، تابعین، تبع تابعین یعنی خیر القرون کے طبقات میں اس درجہ شیوع ہو چکا تھا اور وہ بغیر کسی انکار کے اس درجہ لائقِ قبول ہو چکی تھیں کہ ائمۂ حدیث کے نزدیک حضرتِ مسیح علیہ السلام کی حیات و نزول سے متعلق ان احادیث کو مفہوم و معنی کے لحاظ سے درجۂ "تواتر" حاصل تھا اور اسی لیے وہ بے جھجک اس مسئلہ کو "احادیثِ متواترہ" سے ثابت اور مسلّم کہتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ روایتِ حدیث کے تمام طبقات و درجات میں ان روایات کو "تلقی بالقبول" کا یہ درجہ حاصل رہا ہے کہ ہر دور میں اس کے رواۃ میں

"ائمہ حدیث" اور روایتِ حدیث کے "مدار" نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان مرفوع و موقوف بر صحابہ (رضی اللہ عنہم) احادیث اور روایات کے ناقلین میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ جیسے اصحابِ صحیح و سنن ائمہ حدیث کے اسماء گرامی شامل ہیں اور وہ باتفاق ان روایات کی صحت و حسن کے قائل ہیں، چنانچہ یہ اور اسی قسم کی احادیثِ صحیحہ کا ذکر کرتے ہوئے مشہور محدث و مفسر ابن کثیر اپنی تفسیر میں اول یہ عنوان قائم کرتے ہیں:

ذکر الاحادیث الواردۃ فی نزول عیسیٰ بن مریم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) الی الارض من السماء فی آخر الزمان قبل یوم القیٰمۃ [1]	ان احادیث کا ذکر جو حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کے آسمان سے زمین پر اُترنے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

اور اس کے بعد سلسلہ کی احادیث کو نقل کرنے کے بعد آخر میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

فھذہ احادیث متواترۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من روایۃ ابی ھریرۃ وابن مسعود وعثمان بن العاص وابی امامۃ والنواس بن سمعان وعبد اللہ بن عمرو بن العاص ومجمع بن حارثۃ وابی شریحۃ وحذیفۃ بن اسید رضی اللہ عنھم وفیھا دلالۃ علی صفۃ نزولہ ومکانہ الخ [2]	پس یہ ہیں وہ احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے درجہ تک منقول ہوئی ہیں اور یہ نقلِ روایت (آپؐ کے صحابہ) ابوہریرہ، ابن مسعود، عثمان بن العاص، ابوامامہ، نواس بن سمعان، عبداللہ بن عمرو بن العاص، مجمع بن حارثہ، ابی شریحہ، حذیفہ بن اسید (رضی اللہ عنہم) سے ثابت ہے اور ان روایات میں عیسیٰ بن مریم کے طریقۂ نزول اور مکانِ نزول سے متعلق بھی رہنمائی موجود ہے۔

اور حافظِ حدیث ابن حجر عسقلانی (نور اللہ مرقدہٗ) علامہ ابوالحسین آبری (رحمہ اللہ) سے نزولِ عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق احادیث کے تواتر کو فتح الباری میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کرتے ہیں:-

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۸۳ و ۵۸۴۔

قال ابوالحسن الخشی الابری — ابوالحسن خشی ابری سے منقول ہے کہ احادیثِ رسولؐ میں
بان المهدی من هذه الامة وان — بارہ میں تواتر کو پہنچ چکی ہیں کہ مہدی اسی امت میں سے
عیسٰی یصلی خلفه الخ — ہوں گے اور عیسٰی علیہ السلام اُن کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

اور تلخیص البحیر کتاب الطلاق کے ضمن میں یہ تحریر فرماتے ہیں :-

واما رفع عیسٰی فاتفق اصحاب — لیکن رفع عیسٰی (علیہ السلام) کا معاملہ تو تمام علما و حدیث و تفسیر
الاخبار والتفسیر علی انه بجسده — کا اس پر اجماع ہے کہ وہ اپنے جسدِ عنصری کے ساتھ ہنوز
حیًا الخ — زندہ ہیں (اور وہی قریبِ قیامت نازل ہوں گے)

اور محدثِ عصر محققِ وقت علامہ سید محمد انور شاہ "عقیدۃ الاسلام" میں اس "تواتر" کی تائید میں یہ تحریر فرماتے ہیں :-

والمحدث العلامة الشوکانی — اور محدث علامہ شوکانی نے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے
رسالة سماها التوضیح فی تواتر ما جاء فی المنتظر — جس کا نام یہ رکھا ہے "التوضیح فی التواتر ما جاء فی المنتظر
والدجال والمسیح" اس رسالہ میں انھوں نے انتیس[1] احادیث
فیها تسعة وعشرین حدیثا فی نزوله — حضرت عیسٰی (علیہ السلام) کے نزول سے متعلق نقل کی ہیں جو
علیه السلام وما بین صحیح وحسن و — اصولِ حدیث کے لحاظ سے صحیح، حسن، صالح تینوں درجات کو
صالح هذا وازید منه رفعوا واما — شامل ہیں اور مرفوع احادیث اس تعداد سے بھی زیادہ موجود
الآثار فتفوت الاحصاء الخ — ہیں اور آثارِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) تو بیشمار ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ حضرتِ عیسٰی علیہ السلام کے رفعِ سماوی اور حیات و نزول من السماء پر اُمتِ محمدیہ (علیہا الصلوٰۃ والسلام) کا اجماع منعقد ہو چکا ہے چنانچہ علمِ عقائد و کلام کی مشہور و مستند کتاب عقیدۂ سفارینی میں اُمت کے اس اجماع کی تصریح موجود ہے :-

---

[1] صفحہ ۴ حضرتِ استاذ کا یہ رسالہ اپنے موضوع میں بے نظیر تصنیف ہے، عربی زبان میں تحریر ہے اور علماء و طلبہ دونوں کے لیے لائقِ مطالعہ ہے۔ مصنفِ قصص القرآن اس سلسلہ کے اکثر مباحث میں اسی رسالہ کا خوشہ چین ہے۔

ومنها ای من علامات الساعة العظمی العلامة الثالثة ان ینزل من السماء سید (المسیح) عیسیٰ بن مریم (علیه السلام) ونزوله ثابت بالکتاب والسنة واجماع الامة واما الاجماع فقد اجمعت الامة علی نزوله ولم یخالف فیه احد من اهل الشریعة وانما انکر ذلك الفلاسفة والملاحدة مما لا یعتد بخلافه۔ [1]

اور علاماتِ قیامت میں سے تیسری علامت یہ ہے کہ حضرت مسیح) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) آسمان سے اُتریں گے اور اُن کا آسمان سے اُترنا کتاب (قرآن) سُنّت (حدیث) اور اجماعِ اُمّت سے قطعاً ثابت ہے (قرآن وحدیث سے نزول ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں) جہاں تک اجماعِ اُمّت کا تعلق ہے تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے پر اُمّت کا اجماع ہے اور اس بارہ میں پیروانِ شریعتِ اسلامی میں سے کسی ایک کا بھی خلاف موجود نہیں البتہ فلسفیوں اور مُلحدوں نے نزولِ عیسیٰؑ کا انکار کیا ہے اور اسلام میں اُن کا اِنکار قطعاً بے وقعت ہے۔

حیات ونزولِ مسیحؑ کی حکمت

گذشتہ سطور میں حیات ونزولِ مسیح (علیہ السلام) کو دلائل وبراہین کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے جو ایک منصف اور طالبِ حق کو علمِ یقین عطا کرتے ہیں، اب مزید طمانیتِ قلب کے لیے ان چند حکمتوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو علماءِ حق نے اس سلسلہ میں بیان فرمایا ہے لیکن اس کے مطالعہ سے قبل یہ حقیقت بہرحال پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور اس کی مشیت کی مصلحتوں کا احاطہ عقلِ انسانی کے لیے ناممکن ہے اور مخلوق، خالقِ کائنات کے اسرار وحکم پر عبور بھی کیسے کرسکتی ہے؟ تاہم

---

[1] صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے تین زمانوں کو "خیر القرون" کہا جاتا ہے چونکہ نبی معصوم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان تینوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے "خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونهم، ثم الذین یلونهم" سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر اُن لوگوں کا جو اِس زمانہ سے قریب ہیں اور پھر اُن کا جو اس دوسرے زمانہ سے متصل ہیں اور اُس کے بعد فرمایا "پھر جھوٹ کی کثرت ہوجائے گی یعنی ان ہر سہ ادوار کے بعد اکثریت کے اندر دینی انحطاط پیدا ہوجائے گا اور اسلامی خصوصیاتِ اخلاق سٹ جائے گی۔

علماء اُمت، فراستِ مومن اور علمِ حق کی راہ سے دین اور احکامِ دین کے اسرار و مصالح پر قلم فرسائی کرتے اور اپنی محدود دسترس کے مطابق اس موضوع پر علمی حقائق کا اظہار کرتے آئے ہیں۔ اسلامی دور کی علمی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دورِ اوّل میں علم الاسرار کی امامت کا شرف عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب اور صدیقہ عائشہ (رضی اللہ عنہم) کو حاصل تھا اور اس کے بعد اگرچہ ہر ایک صدی میں دو چار علماءِ ربانی اس کے ماہر و محقق رہے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ خلیفہ اموی عمر بن عبدالعزیز، امام ابوحنیفہ، علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری، حافظ ابن تیمیہ، امام غزالی، رومی، سید مرتضیٰ زبیدی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کو اس علم سے خاص مناسبت تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں اُن کو فطری ملکہ عطا فرمایا تھا۔

بہرحال حکمت کی حیثیت لطائف و نکات کی ہوتی ہے اور اس کو دلیل و حجت کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا اس لیے زیرِ بحث مسئلہ میں بھی "حکمت و مصلحت" کا ذکر اسی نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب ولکل شئ عندہٗ فصل الخطاب۔

(۱) یہود بنی اسرائیل اپنی مذہبی کتابوں کی پیشینگوئیوں اور بشارتوں میں یہ پڑھ چکے تھے کہ ان کو دو شخصیتوں "مسیحِ ہدایت" اور "مسیحِ ضلالت" سے سابقہ پڑے گا اس لیے وہ منتظر تھے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد "مسیحِ ہدایت" کا ظہور کب ہوتا ہے لیکن شومئ قسمت کہ جب مسیحِ ہدایت کا ظہور ہوا تو انھوں نے بغض و حسد کی راہ سے اس کو "مسیحِ ضلالت" کہہ کر رد کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ آمادۂ قتل ہو گئے اور چونکہ قتلِ انبیاء ان کا دستور رہا تھا اس لیے وہ اس پر ہر وقت جری رہتے تھے، پس جبکہ وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح ان کے قتل کے بھی قائل ہو گئے تو یہ تعجب خیز بات نہ ہوئی کہ جب مسیحِ ضلالت (دجال) کا خروج ہو تو یہود اس کو مسیحِ ہدایت کہہ کر قومی حیثیت سے اس کے پیرو ہو جائیں کیونکہ مذہبی تسلیم کے پیشِ نظر ان پر مسیحِ ہدایت کا اتباع ضروری تھا اور جب وہ مسیحِ ہدایت کو مسیحِ ضلالت کہہ کر قتل کر چکے تو اب مسیحِ ضلالت کو ہی اس کے دعوے کے مطابق مسیحِ ہدایت تسلیم کرنے پر

آمادہ ہو جائیں گے مگر مشیتِ الٰہی فیصلہ کر چکی تھی کہ مسیحِ ضلالت کی گمراہی کا فتنہ چونکہ عظیم الشان ہوگا اور وہ اوّل خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اس کے بعد مسیحِ ہدایت بنے گا اس لیے اس کا خروج قیامت کے قریب ہی ہونا چاہیے جو دورِ فتن یعنی فتنوں کی آماجگاہ ہوگا اس لیے حکمتِ الٰہی کا یہ بھی منشاء ہوا کہ مسیحِ ہدایت" کو یہود کے فتنہ سے اس طرح بچا لیا جائے کہ وہ اس کو ہاتھ بھی نہ لگا سکیں اور جب وہ وقت آپہنچے کہ مسیحِ ضلالت اپنی گمراہی کا علم بلند کرے تو مسیحِ ہدایت ملاءِ اعلیٰ سے کائناتِ ارضی پر اُترے اور یہود بنی اسرائیل جو کہ بہ تعدادِ کثیر مسیحِ ضلالت کے پیرو ہو رہے ہوں گے اپنی آنکھوں سے حق و باطل کا مشاہدہ کر لیں اور جب مسیحِ ہدایت کے مقدس ہاتھوں سے مسیحِ ضلالت کا خاتمہ ہو جائے تو "جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا" حق الیقین بن کر اُن کی نگاہوں کے سامنے آجائے اور اس طرح قبولِ حق کے ماسوا ان کے لیے دوسرا چارۂ کار باقی ہی نہ رہے اور یا پھر وہ بھی مسیحِ ضلالت کے ساتھ "فی النار" کر دیے جائیں۔

نیز یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ ادیان و ملل کی تاریخ میں صرف یہود ہی ایک ایسی جماعت ہے جس نے اپنے انبیاء (علیہم السلام) کو بھی قتل کرنے سے ہاتھ نہیں روکا لیکن حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد یہود نے جن انبیاء کے خونِ ناحق سے ہاتھ رنگے تھے وہ صرف "نبی" ہی تھے جو "علماءُ اُمتی کانبیاءِ بنی اسرائیل" کا مصداق تھے مگر کوئی صاحبِ شریعت رسول اُن کے اس قتلِ ناحق کا مظلوم نہیں بنا تھا اس لیے یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے ایک جلیل القدر رسول (عیسیٰ بن مریمؑ) کو قتل کرنے کا نہ صرف ارادہ کیا بلکہ دنیوی اسباب کے لحاظ سے مکمل تیاری کر لی تھی تب مشیتِ حق نے یہ فیصلہ کیا کہ مسیحِ ہدایت کو اس طرح بچا لیا جائے کہ خود یہود کو بھی محسوس ہو جائے کہ وہ مسیح بن مریمؑ پر دسترس نہ پا سکے، لہٰذا فیصلۂ مشیت بروئے کار آیا اور حضرتِ مسیحؑ کو ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا گیا اور تمام دنیوی اسباب ہیچ ہو کر رہ گئے۔ لیکن اس احساس کے باوجود چونکہ حقیقتِ حال تک نہ پہنچ سکے اور ظن و

گمان ہی کے قعر میں پڑے رہے گو اپنی بات رکھنے کے لیے مشہور یہی کرتے رہے کہ ہم نے مسیح بن مریم کو قتل کر دیا۔ ادھر متبعینِ مسیحِ ہدایت (نصاریٰ) کی بدبختی دیکھیے کہ کچھ عرصہ کے بعد پولوس رسول نے ان میں عقیدۂ تثلیث و کفارہ کی بدعت پیدا کر کے یہود کے گھڑے ہوئے افسانۂ صلیب کو بھی داخلِ عقیدہ کر دیا، اور اب یہود و نصاریٰ دونوں جماعتیں اس گمراہی میں مبتلا ہو گئیں کہ عیسیٰ بن مریمؑ صلیب پر چڑھا کر قتل کر دیے گئے۔ تب قرآنِ عزیز نے نازل ہو کر حق و باطل کے درمیان فیصلہ سنایا اور حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے متعلق دونوں جماعتوں نے جو دو الگ الگ رُخ اختیار کیے تھے اور پھر ایک مسئلہ میں دونوں کا اتفاق بھی ہو گیا تھا ان سب کے متعلق علمِ یقین کے ذریعہ حقیقتِ حال کو واشگاف اور دونوں کی گمراہی کو واضح کر کے قبولِ حق کے لیے دعوت دی مگر جماعتی حیثیت سے دونوں نے انکار کر دیا اور حضرتِ مسیحؑ سے متعلق اپنے اپنے گمراہ کن عقیدہ پر قائم رہے مگر عالم الغیب والشہادہ چوں کہ ان حقائق کا ان کے وقوع سے قبل عالمِ دانا تھا اس لیے اس کی حکمت کا یہ بھی تقاضا ہوا کہ مسیحِ ہدایت کو کائناتِ ارضی پر اس وقت دوبارہ بھیجا جائے جب مسیحِ ضلالت کا بھی خروج ہو چکے تاکہ یہود و نصاریٰ کے سامنے حقیقتِ حال مشاہدہ کے درجہ میں روشن ہو جائے۔ یہود آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جس کے قتل کے مدعی تھے قدرتِ الٰہی کے کرشمے کی بدولت وہ بقیدِ حیات موجود ہے اور نصاریٰ نادم ہوں کہ حضرتِ مسیحؑ کی سچی پیروی چھوڑ کر جو گمراہ کن عقیدہ اختیار کیا تھا وہ سرتاپا باطل اور ہیچ تھا اور اس طرح ہدایت و ضلالت کے معرکہ میں حق کی سربلندی اور باطل کی پستی کا دونوں مشاہدہ کر کے قرآنِ عزیز کی تصدیق پر مجبور ہو جائیں اور دونوں جماعتیں "ایمانِ حق" کو برضا و رغبت اختیار کر لیں اور اپنے باطل عقائد پر شرمسار و سرنگوں ہو جائیں۔ اور چونکہ ان دونوں جماعتوں کے علاوہ ہدایت و ضلالت کا یہ مشاہدہ و مظاہرہ دوسرے اہلِ باطل بھی کریں گے اس لیے وہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح احادیثِ صحیحہ کے مطابق اس زمانہ میں کائناتِ ارضی کا صرف ایک ہی مذہب ہو گا اور وہ "اسلام" ہو گا۔

"هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا"

ادیان وملل کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور معاندینِ حق کے درمیان "سُنّۃ اللہ" کے دو مستقل دور رہے ہیں۔ پہلا دور حضرت نوح (علیہ السلام) سے شروع ہو کر حضرت لوط (علیہ السلام) پر ختم ہوتا ہے، اس دور میں سنۃ اللہ یہ رہی کہ جب قوموں نے اپنے پیغمبروں کی صدائے حق پر کان نہ دھرا بلکہ برابر اُس کا تمسخر کرتی اور اس کے پیغامِ حق کے آڑے آتی رہیں، تب اللہ تعالیٰ کے عذاب نے اُن کو ہلاک کر دیا اور دوسروں کے لیے اُن کو باعثِ عبرت وبصیرت بنا دیا۔ اور دوسرا دور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہے۔ اِس دور میں سنت اللہ کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ جب اعداءِ حق اور دشمنانِ دینِ قویم نے کلمۂ حق کی مخالفت پر اصرار کیا، اپنے پیغمبروں کو ایذا دہی اور ان کے ساتھ تمسخر کو اپنا نصب العین بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن قوموں کو ہلاک کرنے کی بجائے اپنے پیغمبروں کو یہ حکم دیا کہ وہ خدا کی راہ میں وطن چھوڑ دیں اور ہجرت کر جائیں چنانچہ حضرت ابراہیمؑ پہلے پیغمبر ہیں جنھوں نے قوم[1] کے سامنے یہ اعلان کیا: "اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْٓ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ" اور عراق سے شام کی جانب ہجرت فرما گئے۔

پھر یہی صورت حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو پیش آئی اور وہ بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر مصر سے شام کو ہجرت کر گئے مگر فرعون اور اس کے لشکریوں نے چونکہ مزاحمت کی اور ہجرت کے بھی آڑے آئے اس لیے وہ بحرِ قلزم میں غرق کر دیے گئے۔

اور یہی صورت نبی اکرم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیش آئی کہ جب قریشِ مکہ نے اذیت، تمسخر، دینِ حق کے ساتھ تصادم، اعمالِ دین کی مزاحمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تب مشیتِ الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ آپؐ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر جائیں، چنانچہ ہر قسم کی نگرانی اور

---

[1] یہ حضرت ابراہیمؑ کی اپنی قوم نہیں تھی اس لیے کہ یہ بنی سام (سامی) تھے اور نمارودِ عراق اور انکی قوم بنی حام (حامی) تھے

مکان کے ہر طرف محاصرہ کے باوجود کرشمۂ قدرت سے آپ محفوظ و مامون مدینہ ہجرت کر گئے۔

"سنت اللہ" کے اسی دور میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت ہوئی اور اُن کی قوم بنی اسرائیل نے ان کے ساتھ اور ان کی دعوتِ حق کے ساتھ بھی وہ سب کچھ کیا جو معاندینِ حق اور دشمنانِ دین اپنے پیغمبروں کے ساتھ کرتے رہے تھے اور اُن میں ایک خصوصیت زیادہ تھی کہ وہ حضرت مسیح (علیہ السلام) سے قبل چند انبیاء کو قتل تک کر چکے تھے اور اب حضرت مسیحؑ کے قتل کے درپے تھے، اسی کے ساتھ یہ مسطورۂ بالا حقیقت بھی فراموش نہیں رہنی چاہیے کہ یہود مسیحِ ہدایت اور مسیحِ ضلالت دونوں مسیح کے منتظر تھے اور حضرت عیسیٰ بن مریم کو مسیحِ ضلالت قرار دے کر آج بھی مسیحِ ہدایت کے منتظر ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی ہجرت، کائناتِ ارضی کی بجائے ملاءِ اعلیٰ کی جانب ہو تاکہ مقررہ وقت آنے پر وہ مسیحِ ہدایت اور مسیحِ ضلالت کے درمیان مشاہدہ سے امتیاز کر سکیں اور ایک جانب اگر مسیحِ ہدایت کو مسیحِ ہدایت سمجھیں تو دوسری جانب قرآن کے فیصلۂ حق کی صداقت و حقانیت کو دیکھ کر دینِ حق "اسلام" کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں اور ساتھ ہی نصاریٰ کو بھی اپنی جہالت اور یہود کی کورانہ تقلید پر ندامت ہو اور وہ بھی تعلیمِ قرآن کی صداقت پر یقین و اعتقاد کے ساتھ شہادت دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

کچھ عجیب صورتِ حال ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) اور خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان دعوت و تبلیغِ حق، اور معاندین کی جانب سے حق کی معاندت و مخالفت، اور پھر اس کے نتائج و ثمرات میں بہت ہی زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے، دونوں کی اپنی قوم نے دونوں کو جھٹلایا، دونوں کی قوموں نے سازشِ قتل کے بعد مکانوں کا محاصرہ کیا، قدرتِ حق کے کرشمۂ اعجاز نے دونوں کو دشمنوں کی دسترس سے ہر طرح محفوظ رکھا، دونوں کے لیے ہجرت کا معاملہ پیش آیا، البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چونکہ بعثتِ عامہ تھی اور اس کی دعوت و تبلیغ کے لیے ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کرۂ ارضی پر قیامِ مسلسل ضروری تھا،

اس لیے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کا حکم ہوا اور عیسیٰ ابن مریم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) چونکہ قوم کو دعوتِ حق پہنچا چکے تھے اور ایک خاص مقصدِ عظیم کے پیشِ نظر ان کا مدتِ مدید کے بعد کائناتِ ارضی پر موجود ہونا ضروری تھا اس لیے اُن کو ہجرتِ ارضی کی بجائے ہجرتِ سماوی پیش آئی پھر جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے قائدِ ضلالت "امیہ بن خلف" کو اپنے حربہ سے قتل کیا، عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) بھی قوم کے مسیحِ ضلالت دجّال کو قتل کریں گے اور جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد آپؐ کے وطن مکہ پر قدرتِ حق نے اقتدار عطا فرما دیا، عیسیٰ بن مریمؑ کا نزول بھی شام ہی کے اس مشہور شہر میں ہوگا جس سے اپنی قوم کی معاندانہ سازشوں کی بناء پر ملاءِ اعلیٰ کی جانب ہجرت پیش آئی تھی اور بیت المقدس، دمشق اور شام کے پورے ملک پر یہود کے علی الرغم ان کی حکومت ہوگی۔[1]

(۳) حضرتِ مسیح (علیہ السلام) سے پہلے قتلِ انبیاء (علیہم السلام) نے یہود کو اس درجہ گستاخ اور بے باک بنا دیا تھا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ کسی ہستی کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ نبی صادق ہے یا متنبی کاذب ہمارے ہاتھ میں ہے اور جس کو ہم اور ہمارے فقیہ کاذب قرار دیدیں، وہ واجب القتل ہے چنانچہ اسی زعمِ باطل میں انھوں نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو مسیحِ ضلالت کہا اور ان کے فقیہوں نے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ حالانکہ یہ وہ جلیل القدر ہستی تھی کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد بنی اسرائیل میں اس پایہ کا کوئی پیغمبر مبعوث ہی نہیں ہوا تھا اور اس نے جدید پیغامِ حق (انجیل) کے ذریعہ روحانیت کی مُردہ کھیتی میں دوبارہ جان ڈال دی تھی، تب اللہ تعالیٰ کی مشیت کا فیصلہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے بنی اسرائیل کے اس زعمِ باطل کو پاش پاش کر دیا جائے اور دکھا دیا جائے کہ ربّ العالمین، خالقِ کائنات جس کی حفاظت کا وعدہ کرلے کائنات کی کوئی ہستی یا مجموعۂ کائنات بھی اس پر دسترس نہیں پا سکتی، چنانچہ یدِ قدرت نے اس وقت اس مقدس ہستی کو جسدِ عنصری کے ساتھ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جبکہ مکان کے محاصرہ کے ساتھ دشمنوں نے اس کی حفاظتِ جان کے تمام وسائلِ دُنیوی مسدود کر دیے تھے۔

[1] خلاصہ از عقیدۃ الاسلام۔

پھر اس واقعہ نے ایک نئی صورت پیدا کر دی، وہ یہ کہ مذاہب کی تاریخ میں صرف حضرت مسیح (علیہ السلام) ہی کی شخصیت ایسی ہے جن کے قتل و عدم قتل کے متعلق حق و باطل کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہوا اور یہود و نصاریٰ کے باہم واقعۂ صلیب و قتل پر اتفاق کے باوجود دو باطل اور متضاد عقائد کی کشمکش نظر آنے لگی۔

یہود قتل و صلیب کی وجہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک وہ "مسیح ضلالت" تھے اور نصاریٰ وجہِ صلیب یہ بتاتے ہیں کہ وہ خدا کے بیٹے تھے جو کائنات کے گناہوں کا کفارہ بننے کے لیے بھیجے گئے تھے تاکہ پاپی دنیا پاپ سے پاک ہو جائے اور صدیوں بعد جب قرآن نے "امرِ حق" کو واضح اور مسیح بن مریم سے متعلق حقیقتِ حال کو روشن کیا تب بھی دونوں جماعتوں نے جماعتی حیثیت سے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا قدرتِ حق کا فیصلہ ہوا کہ خود مسیح بن مریم (علیہما السلام) ہی وقتِ موعود پر نازل ہو کر قرآن کے فیصلہ کی تصدیق کریں اور یہود و نصاریٰ کے باطل عقائد کا خود بخود اس طرح خاتمہ ہو جائے اور اس کے بعد مدعیانِ اہلِ کتاب کو شرک و باطل کی پیروی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور خدا کی حجت اُن پر تمام ہو جائے۔

نیز جبکہ اللہ تعالیٰ نے کائناتِ ہست و بود کے لیے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ خدا کی ہستی کے ماسوا ہر ایک وجود کو فنا اور موت ہے "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ" اور یہ ظاہر ہے کہ ملاءِ اعلیٰ اور عالمِ قدس مقامِ موت نہیں ہے بلکہ مقامِ حیات ہے اس لیے ازبس ضروری ہے کہ عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) بھی موت کا ذائقہ چکھیں اور اس کے لیے کائناتِ ارضی پر اُتریں تاکہ زمین کی امانت زمین ہی کی سپرد ہو اس لیے حیات و رفع کے بعد "نزولِ ارضی" مقدر ہوا[1]۔

علماءِ حق نے حیات و نزولِ عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جو "اسرار و حکم" بیان فرمائے ہیں یہاں اُن کا احاطہ مقصود نہیں ہے اس لیے مختصر چند حکمتوں کا ذکر کر دیا گیا ورنہ محدثِ عصر علامہ سید محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ نے اس سلسلہ میں ایک طویل مقالہ عقیدۃ الاسلام میں سپردِ قلم فرمایا ہے جو لائقِ مطالعہ ہے، حضرتِ استاد نے نہایت لطیف مگر دقیق پیرایۂ بیان میں کائناتِ عالم کو

[1] فتح الباری ج ۱۔

"انسانِ کبیر" اور انسان کو "عالمِ صغیر" قرار دے کر ان ہر دو عالم کی حیات و موت پر جو بحث فرمائی ہے اس سے حضرت مسیحؑ کے رفع اور قربِ قیامت میں کائناتِ ارضی کی جانب رجوع کی حکمت بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے لیکن یہ کتاب چونکہ اس دقیق بحث کی متحمل نہیں ہے اس لیے اپنی جگہ قابلِ مراجعت ہے۔

آخر میں اب اپنی جانب سے چند جملے اس سلسلہ میں اضافہ کر کے اس مبحث کو ختم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۴) قرآنِ عزیز میں میثاقِ انبیاءؑ سے متعلق یہ ارشادِ باری ہے:-

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ	اور وہ وقت قابلِ ذکر ہے جبکہ اللہ نے نبیوں سے (یہ)
النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ	عہد لیا کہ جب تمہارے پاس (خدا کی جانب سے) کتاب اور
كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ	حکمت آئے پھر ایسا ہو کہ تمہاری موجودگی میں ایک
مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ	رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آئے جو تصدیق کرتا ہو ان
وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ	کتابوں کی جو تمہارے پاس ہیں ضرور تم اس پر ایمان لانا
وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ	اور ضرور اس کی مدد کرنا، اللہ نے کہا: کیا تم نے اقرار کیا!
قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا	انھوں نے جواب دیا ہاں ہم نے اقرار کیا، اللہ نے کہا:
وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝	پس تم اپنے اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ
(سورۂ آلِ عمران پ ۳ ع ۹)	گواہ ہوں۔

آلِ عمران کی ان آیات میں حسبِ تفسیر حضرت ابنِ عباس (رضی اللہ عنہما) اس عہد و پیمان

لہ عن علی و ابن عباس فی تفسیر آیۃ "ما بعث اللہ نبیا من الانبیاء الا اخذ علیہ المیثاق لئن بعث اللہ محمدا وھو حی لیؤمنن بہ ولینصرنہ وامرہ ان یاخذ المیثاق علی امتہ لئن بعث محمد وھم احیاء لیومنن بہ ولینصرنہ (تفسیر ابن کثیر ۱۲)

اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں سے جس نبی کو بھی کسی قوم کی رشد و ہدایت کیلیے مبعوث فرمایا تو اس سے یہ عہد ضرور لیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اس وقت زندہ ہو جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوگی تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا اور ان سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی اپنی امتوں سے بھی یہی عہد و پیمان لیں کہ ان میں سے جو اس وقت موجود ہوں وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں۔

کا تذکرہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ازل میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انبیاء و رسل (علیہم السلام) سے لیا، قرآن کے اسلوبِ بیان کے مطابق اگرچہ یہ خطاب انبیاء و رسل کی معرفت ان کی امتوں سے تھا کہ ان میں سے جو اُمتیں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ مُبارک پائیں تو اُن پر ایمان لائیں اور دعوتِ حق میں اُن کی نصرت و یاری کریں چنانچہ ہر ایک پیغمبر نے اپنے اپنے دور میں تعلیمِ حق کے ساتھ ساتھ خدا کے اس وعدہ کو بھی یاد دلایا اور ان میں سے اہلِ حق نے وعدہ دیا اور اقرار کیا کہ ضرور اُن پر ایمان لائیں گے اور پیغامِ حق میں اُن کی مدد کریں گے۔

تو یہ "میثاق النبیین" اگرچہ اس طرح پورا ہوتا رہا تاہم ازل میں چونکہ اس عہد و میثاق کے اوّل مخاطب حضراتِ انبیاء و رسل تھے اس لیے اس میثاق کی عملی حیثیت کا تقاضا تھا کہ خود انبیاء و رُسُل میں سے بھی کوئی نبی یا رسول اس عہد و میثاق کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائے تاکہ یہ خطاب اوّلین براہِ راست بھی مؤثر ثابت ہو مگر "ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ" میں بقاعدۂ عربیت خطاب تھا اُن تمام انبیاء و رسل سے جو ذاتِ اقدس سے پہلے اس کائناتِ ارضی میں مبعوث ہونے والے تھے کیونکہ ازل ہی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے یہ مقرر ہو چکا تھا "وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت "خاتم النبیین" اور ازل سے مقدر "میثاق النبیین" کا اجتماع صرف اسی ایک شکل میں ممکن تھا کہ انبیاءِ سابقین میں کوئی ایک پیغمبر بعثتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نزول فرمائیں اور وہ اور اُن کی اُمت دنیائے انسانی کے سامنے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور "دینِ حق" کی مدد و نصرت کا مظاہرہ کریں تاکہ "لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ" کا وعدۂ حق پورا ہو۔

گذشتہ صفحات میں یہ حقیقت بخوبی عیاں ہو چکی ہے کہ اگرچہ تمام انبیاء و رُسل اپنے اپنے زمانہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارات دیتے چلے آتے تھے لیکن یہ خصوصیت حضرت عیسیٰؑ ہی کے حصہ میں آئی کہ وہ ذاتِ اقدس کی بعثت کے لیے تمہید اور براہِ راست منادی و مبشر بنے اور بنی اسرائیل کو تعلیمِ حق دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا: "اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ

يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ" اور حقیقت یہ ہے کہ خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہی کا یہ حق تھا کہ وہ خاتم الانبیاء والرسل کی بعثت کا "منادی" اور "مبشر" ہو اسلیے حکمتِ ربانی کا یہ فیصلہ ہوا کہ میثاق النبیین کے وقار کے لیے ان ہی کو منتخب کیا جائے اور اس معاملہ میں وہی تمام انبیاء و رسل کی نمائندگی کریں تاکہ امتوں کی جانب سے ہی نہیں بلکہ براہِ راست انبیاء و رسل کی جانب سے وفاءِ عہد کا عملی مظاہرہ ہو سکے، اسی حقیقت کے پیشِ نظر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: انا اولی الناس بعیسی بن مریم والانبیاء اولاد علات لیس بینی وبینہ نبی

مگر قرآن چونکہ خدا کا آخری پیغام ہے اور "اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" کے وعدۂ الٰہی نے رہتی دنیا تک اس کو تحریف سے محفوظ کر دیا ہے اس لیے قدرتی طور پر اس کی تعلیم کے ثمرات دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے مقابلہ میں مدتِ طویل تک اپنا کام کرتے رہیں گے اور اس کی روشنی سے قلوب کو گرمانے اور طاعتِ ربانی کے لیے مشتعل کرنے کے لیے علماءِ امت "انبیاءِ بنی اسرائیل" کی طرح خدمتِ حق انجام دیتے رہیں گے۔ لیکن جب بعثتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گذرے ہوئے بہت ہی طویل عرصہ ہو جائے گا اور امتِ مرحومہ کے عملی قویٰ اور اجتماعی اعضاء میں انتہائی انحلال پیدا ہو کر یہ کیفیت ہو جائے گی کہ ان کی بیداری اور تیزروی کے لیے صرف علماءِ حق کی روحانیت ہی کافی ثابت نہیں ہوگی وہ وقت اس کا متقاضی ہوگا کہ کوئی "قائم بالحجۃ" ان کو سنبھالے اور اس لیے مشیتِ الٰہی نے مقدر کیا کہ جو ہستی (عیسیٰ بن مریمؑ) انبیاء و رسل کے میثاقِ ازل کی نمائندگی کے لیے مامور ہے اس کا ایسے ہی وقت نزول ہو اور وہ امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان رہ کر ذاتِ اقدس کی نیابت اور امت کی امامت کا فرض انجام دے اور "لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ" کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائے۔

اب کرشمۂ قدرت دیکھیے کہ ازل کے ان مقدرات نے جو کہ ملاءِ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے کائناتِ ارضی میں کس طرح اپنی بساط بچھائی! بنی اسرائیل اپنے جلیل القدر پیغمبر کے قتل کے لیے سازش مکمل کر چکے ہیں شاہی دستہ چہار جانب سے مکان کو محصور کیے ہوئے ہے مگر

مگر قدرتِ حق اپنا کام اس طرح نہیں کرتی کہ معجزانہ کرشمہ کے ذریعہ ان کو محفوظ وہاں سے نکال کر خدا کی وسیع زمین کے دوسرے حصہ میں "ہجرت" کرا دیتی نہیں بلکہ ہوا یہ کہ اُن کو ملاءِ اعلیٰ کی ہجرت کے لیے محفوظ و مامون زندہ اٹھا لیا اور سازش و محصور کرنے والوں کو ظن و ریب کی دلدل میں پھنسا کر ان کے خسر الدنیا والآخرہ کا نشان عطا کر دیا اور پھر ارضی انسان کے ارضی احکام کے لیے وہ وقت مقرر کر دیا جو "میثاق النبیین" کی نمایندگی کے لیے موزوں تھا، یہی ہے وہ حقیقت جس کو زبانِ وحی ترجمان نے اس طرح ظاہر فرمایا: "وَالَّذِی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکماً عدلاً" اور اسی کو نصِ قرآن نے یوں واضح کیا ہے:

"وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ"

پھر یہ ہستی میثاق انبیاء و رسل کی نمائندگی کا اس طرح حق ادا کرے گی کہ جب اس کا نزول ہوگا تو اس کرشمۂ قدرت کو دیکھ کر مسلمانوں کے قلوب تصدیقِ قرآن اور تازگیِ ایمان سے روشن ہو جائیں گے اور وہ حق الیقین کے درجہ میں یقین کریں گے کہ بلاشبہ راہِ مستقیم صرف اسلام ہی ہے اور مخبرِ صادق کی جس طرح یہ خبرِ صادق بکلی عالمِ غیب سے متعلق اس کی تمام خبریں اسی طرح حق اور بلاشبہ حق ہیں، اور نصاریٰ بحیثیتِ قوم اپنے باطل عقیدہ تثلیث و کفارہ پر نادم و شرمسار ہوں گے اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو اپنے لیے راہِ نجات اور راہِ سعادت یقین کریں گے اور یہود جب مسیحِ ہدایت اور مسیحِ ضلالت کے معرکۂ حق و باطل کا مشاہدہ کر لیں گے اور مسیحِ ہدایت کے نزول سے اپنے دعوئے قتل و صلیب کے ملعون عقیدہ کو باطل پائیں گے تو اب ان کو بھی "ایمان بالحق" کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہے گا اور مسیحِ ضلالت کے رفقاء کے علاوہ وہ سب ہی "مسلم" بن جائیں گے یہی ہے قرآن کی وہ خبرِ صادق "وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ" مسلمانوں میں ایمان کی تازگی، شگفتگی، نصاریٰ اور یہود میں تبدیلیِ عقائد کا حیرت انگیز انقلاب دیکھ کر اب مشرک جماعتوں پر بھی قدرتی اثر پڑے گا اور ساتھ ہی خدا کے مقدس پیغمبر کے زیرِ دست روحانی اثرات کارفرما ہوں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ

وہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح وحی ترجمان، حاملِ قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد اپنی صداقت کو نمایاں کرے گا۔ ویدعو الناس الی الاسلام ویھلك اللہ فی زمانہ الملل کلھا الا الاسلام ویھلك اللہ فی زمانہ الدجال۔

اس تفصیل سے یہ بھی روشن ہو گیا کہ قرآن اور احادیث کی تصریحات ثابت کر رہی ہیں کہ اگر اس فرض کی انجام دہی کے لیے کوئی جدید نبی مبعوث ہوتا تو ایک جانب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی شرف "خاتم النبیین" باقی نہ رہتا اور دوسری جانب "میثاق النبیین" کے خطاب اولین کا عملی مظاہرہ عالمِ وجود میں نہ آتا کیونکہ وہ ہستی بہر حال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہی میں سے ہوتی۔ البتہ سابقہ نبی کی آمد نقلاً اور عقلاً دونوں حیثیت سے شرفِ خصوصی "خاتم النبیین" کے لیے بھی قادح نہیں ہے۔ اور "میثاق النبیین" کو بھی پورا کرتی ہے۔

واقعاتِ نزول صحیح احادیث کی روشنی میں

گذشتہ صفحات میں نزولِ عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق جو صحیح احادیث ذکر کی گئیں اور ان سے اور بعض دوسری صحیح احادیث سے جو تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں ان کو ترتیب کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

قیامت کا دن اگرچہ معین ہے مگر ذاتِ باری کے ماسوا کسی کو اس کا علم نہیں ہے اور اس کا وقوع اچانک ہوگا "وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ" اور قیامت کا علم خدا ہی کو ہے "حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً" حتیٰ کہ ان پر اچانک قیامت کی گھڑی آجائے گی "لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً" "قیامت ان پر نہیں آئے گی مگر اچانک" اور حدیثِ جبرئیل میں ہے "ما المسؤل عنھا باعلم من السائل" (جبرئیل نے کہا) قیامت کے بارہ میں آپ سے زیادہ مجھے بھی علم نہیں، جو اجمالی علم آپ کو ہے اسی قدر مجھ کو بھی ہے" اور ایک حدیث میں ہے "سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول قبل ان یموت بشھر، تسألون عن الساعۃ وانما علمھا عند اللہ۔ تم مجھ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہو تو اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔" البتہ قرآنِ عزیز اور احادیثِ صحیح نے چند ایسی علامات بیان کی ہیں جو قیامت کے قریب

پیش آئیں گی اور اُن سے صرف اُس کے نزدیک ہو جانے کا پتہ چل سکتا ہے، اُن اشراطِ ساعت میں سے ایک بڑی علامت حضرت مسیحؑ کا ملاءِ اعلیٰ سے نزول ہے جس کی تفصیل یہ ہیں:

"مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان سخت معرکہ جنگ بپا ہو رہا ہوگا اور مسلمانوں کی قیادت و امامت سُلالۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوگی جس کا لقب "مہدی" ہوگا، اس معرکہ آرائی کے درمیان ہی میں مسیحِ ضلالت "دجّال" کا خروج ہوگا یہ نسلاً یہودی اور یک چشم ہوگا، کرشمۂ قدرت نے اس کی پیشانی پر (ک، ا، فر) کا فرق رکھ دیا ہوگا جس کو اہلِ ایمان فراستِ ایمانی سے پڑھ سکیں گے اور اُس کے دجل و فریب سے بچتے رہیں گے۔ یہ اوّل خدائی کا دعویٰ کرے گا اور شعبدہ بازوں کی طرح شعبدے دکھا کر لوگوں کو اپنی جانب توجہ دلائے گا، مگر اس سلسلہ کو کامیاب نہ دیکھ کر کچھ عرصہ کے بعد "مسیحِ ہدایت" ہونے کا مدعی ہوگا، یہ دیکھ کر یہود بکثرت بلکہ قومی حیثیت سے اس کے پیرو ہو جائیں گے، اور یہ اس لیے ہوگا کہ یہود مسیحِ ہدایت کا انکار کر کے ان کے قتل کا ادعاء کر چکے ہیں اور مسیحِ ہدایت کی آمد کے آج تک منتظر ہیں، اسی حالت میں ایک روز دمشق (شام) کی مسجد جامع میں مسلمان منہ اندھیرے نماز کے لیے جمع ہوں گے، نماز کے لیے اقامت ہو رہی ہوگی اور مہدی موعود امامت کے لیے مصلے پر پہنچ چکے ہوں گے کہ اچانک ایک آواز سب کو اپنی جانب متوجہ کرے گی، مسلمان آنکھ اُٹھا کر دیکھیں گے تو سپید بادل چھایا ہوا نظر آئے گا اور تھوڑے سے عرصہ میں یہ مشاہدہ ہوگا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) دو زرد حسین چادروں میں لپٹے ہوئے اور فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا دیے ہوئے ملاءِ اعلیٰ سے اُتر رہے ہیں، فرشتے اُن کو مسجد کے منارۂ شرقی پر اُتار دیں گے اور واپس چلے جائیں گے، اب حضرت عیسیٰؑ کا تعلق کائناتِ ارضی کے ساتھ دوبارہ وابستہ ہو جائے گا اور وہ عام قانونِ فطرت کے مطابق صحنِ مسجد میں اُترنے کے لیے سیڑھی کے طالب ہوں گے، فوراً تعمیل ہوگی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز کی صفوں میں آکھڑے ہوں گے، مسلمانوں کا

امام (مہدی موعود) ازرہِ تعظیم پیچھے ہٹ کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے امامت کی درخواست کرے گا۔ آپ فرمائیں گے کہ یہ اقامت تمہارے لیے کہی گئی ہے اس لیے تم ہی نماز پڑھاؤ، فراغتِ نماز کے بعد اب مسلمانوں کی امامت حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ہاتھوں میں آجائے گی اور وہ حربے کر مسیحِ ضلالت (دجال) کے قتل کے لیے روانہ ہوجائیں گے اور شہر پناہ کے باہر اُس کو بابِ لُد پر مقابل پائیں گے، دجال سمجھ جائے گا کہ اُس کے دجل اور زندگی کے خاتمہ کا وقت آپہنچا اُس لیے خوف کی وجہ سے رانگ کی طرح پگھلنے لگے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آگے بڑھ کر اس کو قتل کر دیں گے اور پھر جو یہود دجال کی رفاقت میں قتل سے بچ جائیں گے وہ اور عیسائی سب اسلام قبول کرلیں گے اور مسیحِ ہدایت کی سچی پیروی کے لیے مُسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آئیں گے، اس کا اثر مُشرک جماعتوں پر بھی پڑے گا اور اس طرح اس زمانہ میں اسلام کے ماسوا کوئی مذہب باقی نہیں رہے گا۔

ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد یاجوج وماجوج کا خروج ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کو اس فتنہ سے محفوظ رکھیں گے، حضرت مسیح (علیہ السلام) کا دورِ حکومت چالیس[1] سال رہے گا اور اس درمیان میں وہ ازدواجی زندگی بسر کریں گے اور اُنکے دورِ حکومت میں عدل وانصاف اور خیر وبرکت کا یہ عالم ہوگا کہ بکری اور شیر ایک گھاٹ پانی پئیں گے اور بدی اور شرارت کے عناصر دب کر رہ جائیں گے۔[2]

وفاتِ مسیح علیہ السلام چالیس سالہ دورِ حکومت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہوجائے گا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہوں گے حضرت ابوہریرہؓ کی طویل حدیث میں ہے:

---

[1] ابوداؤد میں ہے کہ دورِ حکومت سات سال رہے گا حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جب مسیح کا رفع سماوی ہوا اس وقت اُن کی عمر تینتیس سال تھی اور نزول کے بعد سات سال مزید بقیدِ حیات رہیں گے اس طرح کائناتِ ارضی میں کل مدتِ حیات چالیس سال ہوجائے گی۔ [2] ماخوذ از صحیح احادیث عن ابن عساکر فی تاریخہ۔

فیمکث اربعین سنۃ ثم	پھر وہ کائناتِ ارضی پر اُتر کر چالیس سال قیام کریں گے اور
یتوفّٰی ویصلّٰی علیہ المسلمون	اس کے بعد وفات پا جائیں گے اور مسلمان ان کے جنازہ کی
ویدفنونہ۔[1]	نماز پڑھیں گے اور ان کو دفن کریں گے۔

اور ترمذی نے بسندِ حسن محمد بن یوسف بن عبداللہ بن سلام کے سلسلہ سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے:-

قال مکتوبٌ فی التوراۃ	عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا، تورات میں محمد (صلی اللہ
صفۃ محمدٍ وعیسٰی ابن مریم	علیہ وسلم کی صفت (حُلیہ وسیرت) مذکور ہے اور یہ بھی مسطور ہے کہ
یدفن معہ[2]	عیسٰی بن مریم (علیہما السلام) ان کے ساتھ (پہلو میں) دفن ہوں گے۔

ویوم القیٰمۃ یکون	سورۂ مائدہ میں حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے مختلف حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔
علیھم شھیدا	پھر آخر سورۃ بھی ان ہی کے تذکرہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ

نے اوّل قیامت کے اس واقعہ کا نقشہ کھینچا ہے جب انبیاء علیہم السلام سے اُن کی اُمتوں کے متعلق سوال ہوگا اور وہ غایتِ ادب سے اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے اور عرض کریں گے خدایا! آج کا دِن تو نے اس لیے مقرر فرمایا ہے کہ ہر معاملہ میں حقائقِ امور کے پیشِ نظر فیصلہ سُنائے اور ہم چونکہ صرف ظواہر ہی پر کوئی حکم لگا سکتے ہیں اور قلوب اور حقائق کا دیکھنے والا تیرے سوا کوئی نہیں اس لیے آج ہم کیا شہادت دے سکتے ہیں، صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں تو علّام الغیوب ہے اس لیے تو ہی سب کچھ جانتا ہے:-

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ	وہ دن (قابلِ ذکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو جمع کرے گا
فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا	پھر کہے گا تم (اپنی اپنی اُمتوں کی جانب سے) کیا جواب دیے گئے؟
لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّکَ اَنْتَ	وہ (پیغمبر) کہیں گے (تیرے علم کے سامنے) ہم کچھ نہیں جانتے

---

[1] اس سے قبل یہ حدیث مکمل نقل کی گئی ہے۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے مصنّف میں، امام احمد نے مسند میں، ابوداؤد نے سنن میں، ابن جریر نے تفسیر میں اور ابن حبان نے صحیح میں حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے ۱۲۔ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۸۴۔

عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (مائدہ پ ۷) بلاشبہ تو ہی غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے

ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا "لاعلم لنا" فرمانا علم حقیقی کی نفی پر ہی مبنی ہوگا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ درحقیقت اپنی اُمتوں کے جواب سے لاعلم ہیں کہ کس نے ایمان کو قبول کیا اور کس نے انکار کیا کیونکہ جواب کا مقصد اگر یہ ہو تو یہ صریح جھوٹ اور کذب بیانی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی جانب اِس عمل بَد کی نسبت ناممکن ہے اس لیے انبیاء علیہم السلام کا یہ جواب مسطورۂ بالا حقیقت کے ہی پیشِ نظر ہوگا۔ ظاہر حالات کے علم سے انکار پر مبنی نہیں ہوگا اِس کے لیے خود قرآن عزیز ہی شاہدِ عدل ہے کیونکہ وہ متعدد جگہ یہ کہتا ہے کہ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اُمتوں پر شہادت دیں گے کہ ہم نے اُن تک خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا اور یہ کہ انھوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا یا رَد کر دیا۔ تو ان ہر دو مقامات پر نظر رکھنے کے بعد یُوں کہا جائے گا کہ پاسِ ادب کے طریقہ پر اوّل انبیاء علیہم السلام کا یہی جواب ہوگا جو مائدہ میں مذکور ہے لیکن جب ان کو خدائے برتر کا یہ حکم ہوگا کہ وہ صرف اپنے علم کے مطابق شہادت دیں تب وہ شہادت دیں گے۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ	پھر (اے پیغمبر!) کیا حال ہوگا اس دن (یعنی قیامت کے دن)
أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ	جب ہم ہر ایک امت سے ایک گواہ طلب کریں گے (یعنی اس کے
عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا۔	پیغمبر کو طلب کریں گے جو اپنی اُمت کے اعمال و احوال پر گواہ ہوگا)
(نساء پ ع)	اور ہم تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے طلب کریں گے۔
وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ	اور لائے جائیں گے (قیامت کے دن) انبیاء اور شہداء اور فیصلہ کیا
وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ (زمر پ ع)	جائے گا ان لوگوں کے درمیان اچھائی اور برائی کا حق کے ساتھ۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) نے بھی "لاعلم لنا" کی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

عن ابن عباس یوم یجمع	حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) آیت یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ
اللّٰه (الآیہ) یقولوا الرب	الرُّسُلَ (الآیہ) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: انبیاء علیہم السلام رب
عزّ وجل لا علم لنا الا	عزّ وجل سے عرض کریں گے ہم کو کوئی علم نہیں ہے مگر ایسا علم کہ

علم انت اعلم بہ منا۔[1] جس کے متعلق تو ہم سے بہتر جانتا ہے۔

اور شیخ المحققین علامہ سید انور شاہ (رحمہ اللہ) آیت کے جملہ "لاعلم لنا" کو "علمِ حقیقی کے انکار" پر محمول کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ بات مُسلّم ہے کہ ایک انسان کو ـــــ خواہ وہ کسی درجہ اور رتبہ کا ہو ـــــ دوسرے انسان کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوتا ہے وہ علمِ حقیقی کے لحاظ سے "ظن" کے درجہ سے آگے "علم" تک نہیں پہنچتا، اسی بناء پر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے "نحن نحکم بالظواھر واللہ متولی السرائر" ہم ظاہر معاملات پر حکم لگاتے ہیں اور بھیدوں اور حقیقتوں پر تو صرف خدا کو ہی قابو حاصل ہے، نیز ایک دوسری حدیث میں ہے ذاتِ اقدس نے ارشاد فرمایا، تم میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو اور بعض تم میں سے زیادہ چرب زبان ہوتے ہیں اور مجھ کو علمِ غیب نہیں ہے کہ حقیقت سے آگاہ ہو جایا کروں اس لئے جو بھی فیصلہ دیتا ہوں ظاہر حالات پر ہی دیتا ہوں تو یاد رہے کہ جو شخص بھی اپنی چرب زبانی سے کسی بھائی کا ادنیٰ سا ٹکڑا بھی ناحق حاصل کرے گا وہ بلاشبہ جہنم کا ٹکڑا حاصل کرے گا"[2]

بہرحال قرآن عزیز، احادیثِ رسولؐ، آثارِ صحابہؓ، اور اقوالِ علماء سب یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اس موقع پر انبیاء علیہم السلام کا جواب "عدمِ علم" کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ازراہِ پاسِ ادب "حقیقی علم پر انکار" کو واضح کرتا ہے۔

غرض ذکر یہ تھا کہ اصل مقام پر اصل تذکرہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ کا ہو رہا ہے جو قیامت میں پیش آئے گا جبکہ اللہ تعالیٰ اُن پر اپنے انعامات شمار کرانے کے بعد اُن سے اُن کی اُمت کے متعلق سوال کرے گا اور وہ حسبِ حال جوابات پیش کریں گے مگر سابق آیات میں چونکہ دوسرے مطالب ذکر ہوئے تھے اس لئے اُن سے امتیاز پیدا کرنے کے لیے تمہید اً قیامت میں ہونے والے اُن سوال و جواب کا ذکر ضروری ہوا جو عام طور پر انبیاء علیہم السلام سے اُن کی اُمتوں کے متعلق کیے جائیں گے اور اس لیے بھی یہ تذکرہ ضروری

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱۔ [2] عقیدۃ الاسلام ص ۱۶۵۔

تھا کہ اگلی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کا پیرایۂ بیان بھی انبیاء علیہم السلام کے جواب کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ	اور (وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے) جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابن مریمؑ
ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ	سے کہے گا "کیا تو نے لوگوں (بنی اسرائیل) سے کہہ دیا تھا کہ
اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ	مجھ کو اور میری ماں کو دونوں کو اللہ کے ماسوا خدا بنا لینا عیسیٰ۔
سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ	کہیں گے" پاکی تجھ کو ہی زیبا ہے میرے لیے کیسے ممکن تھا کہ میں
مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ	وہ بات کہتا جو کہنے کے لائق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات ان سے
فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ	کہی ہوتی تو یقیناً تیرے علم میں ہوتی (اس لیے کہ) تو وہ سب
اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ	کچھ جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں تیرا بھید نہیں پا سکتا
عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا	بلاشبہ تو غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے، میں نے
مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ	اس بات کے ماسوا جس کا تو نے مجھ کو حکم دیا ان سے اور کچھ نہیں
رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا	کہا وہ یہ کہ صرف اللہ ہی کی پوجا کرو جو میرا اور تمہارا سب کا
مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ	رب ہے اور میں اُن پر اس وقت تک کا گواہ ہوں جب تک
اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى	میں ان کے درمیان رہا پھر جب تو نے مجھ کو قبض کر لیا تب
كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ	تو ہی ان پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے اگر تو ان سب کو
عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ	عذاب چکھائے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دے
اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (مائدہ ع ۱۶)	پس تو ہی بلاشبہ غالب حکمت والا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اپنا جواب دے چکیں گے تب اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرمائے گا:

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ	اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ ایسا دن ہے کہ جس میں راستبازوں کی
صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ	راستبازی ہی کام آسکتی ہے، ان ہی کے لئے بہشت ہے جن
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ	کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۔ اور وہ خدا سے راضی اور خدا اُن سے راضی (کا مقام اعلیٰ
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (مراد پڑھ) پائیں گے) یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا جواب ایک جلیل القدر پیغمبر کی عظمتِ شان کے عین مطابق ہے، وہ پہلے بارگاہِ رب العزت میں عذر خواہ ہوں گے کہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ایسی نامناسب بات کہتا جو قطعاً ان کے خلاف ہے "سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ" پھر پاسِ ادب کے طور پر خدا کے علمِ حقیقی کے سامنے اپنے علم کو ہیچ اور بے علمی کے مرادف ظاہر کریں گے "اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ" اور اس کے بعد اپنے فرض کی انجام دہی کا حال گذارش کریں گے "مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ" اور پھر اُمت نے اس دعوتِ حق کا جواب کیا دیا؟ اس کے متعلق ظاہر اُمور کی شہادت کا بھی اس اسلوب کے ساتھ ذکر کریں گے جس میں ان کی شہادت خدا کی شہادت کے مقابلہ میں بے وقعت نظر آئے "وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ" اور اس کے بعد یہ جانتے ہوئے کہ اُمت میں مومنینِ قانتین بھی ہیں اور منکرینِ جاحدین بھی، وقوعِ عذاب اور طلبِ مغفرت کا اس انداز میں ذکر کریں گے جس سے ایک جانب خدا کے مقرر کردہ پاداشِ عمل کے قانون کی خلاف ورزی بھی مترشح نہ ہو اور دوسری جانب اُمت کے ساتھ رحمت و شفقت کے جذبہ کا جو تقاضا ہے وہ پورا ہو جائے "اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ"

جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) عرضداشت یا جواب کے مضمون کو ختم کر چکے تو رب العالمین نے اپنے قانونِ عدل کا یہ فیصلہ سنا دیا تاکہ مستحقِ رحمت و مغفرت کو مایوسی نہ پیدا ہو بلکہ مسرت و شادمانی سے اُن کے قلوب روشن ہو جائیں اور مستحقِ عذاب غلط توقعات قائم نہ کر سکیں "قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ" (الآیہ)

اِن تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ آیاتِ زیرِ بحث کا سیاق و سباق صراحت کرتا ہے

کہ یہ واقعہ قیامت کے روز پیش آئے گا اور حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے ملاءِ اعلیٰ پر اُٹھا لیے جانے کے وقت پیش نہیں آیا۔ اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی ابتداء "یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ" (الآیہ) سے کرنا اور انتہاءِ واقعہ "ھٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُھُمْ" (الآیہ) پر ہونا روزِ قیامت کے ماسوا اور کسی دن پر صادق نہیں آسکتا اور اس ایک قطعی بات کے علاوہ دوسرے کسی احتمال کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔

نیز یہ تفصیلات واضح کرتی ہیں کہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) اپنی اُمت کے قبول و انکار کے حالات سے آگاہی کے باوجود آیاتِ مائدہ میں مذکور اسلوبِ بیان اس لیے اختیار فرمائیں گے کہ دوسرے انبیاء و رسل (علیہم السلام) بھی مقام کی نزاکتِ حال اور ربّ العزت کے دربار میں غایتِ پاسِ ادب کے لیے یہی اسلوبِ بیان اختیار فرمائیں گے۔

اور حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے اور انبیاء علیہم السلام کے جوابات میں اسلوبِ بیان کی یکسانیت کے باوجود اجمال و تفصیل کا فرق صرف اس لیے ہے کہ زیرِ بحث آیات میں اصل مقصود حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) اور اُن کی اُمت کے قبول و انکار اور اُن کے نتائج و ثمرات کا تذکرہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کا ذکر صرف واقعہ کی تمہید کے طور پر ہے۔

حقیقتِ حال کے اس انکشاف کے بعد اب جمہور امتِ مسلمہ کے خلاف خلیفہ قادیانی مسٹر محمد علی لاہوری کی تحریفِ معنوی بھی قابلِ مطالعہ ہے، کہتے ہیں کہ سورۂ مائدہ میں مذکور حضرتِ عیسیٰؑ اور پروردگارِ عالم کا یہ سوال و جواب اس وقت پیش آچکا جب حضرتِ عیسیٰؑ کی نعش ملنے پر شاگردوں نے ان کا علاج کر کے چنگا کر لیا اور پھر وہ شام سے فرار ہو کر مصر اور مصر سے کشمیر پہنچے اور گمنامی کی حالت میں انتقال فرما گئے۔ مسٹر لاہوری نے اپنے دعوے میں دو دلائل پیش کئے ہیں: ایک یہ کہ عربیت کے قاعدے سے لفظ "اذ" ماضی کے لیے مستعمل ہے نہ کہ مستقبل کے لیے اور دوسری دلیل یہ کہ اگر جمہور کے عقیدہ کے مطابق حضرتِ مسیحؑ کا انتقال نہیں ہوا اور وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے تو ضروری ہے کہ ان کو اپنی

اُمت (نصاریٰ) کے عقیدۂ الوہیتِ مسیحؑ اور تثلیث کا علم ہو چکا ہوگا کیونکہ نصاریٰ نے ان کے رفع کے زمانہ تک تثلیث کو نہیں اپنایا تھا اور اگر ایسا ہوتا تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا جواب ایسے اسلوب پر نہ ہوتا جس سے اُن کی لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔

مسٹر لاہوری نے قرآن کی تحریفِ معنوی پر یہ اقدام یا تو اس لیے کیا کہ اپنے مرشد متنبیِ قادیان (علیہ ماعلیہ) کے دعوئے مسیحیت کو قوت پہنچائیں اور مغالطہ اور سفسطہ سے کام لے کر "خسرانِ مبین" کا سامان مہیا کریں اور یا پھر وہ قواعدِ عربیت سے اس درجہ ناواقف ہیں کہ نہ اُن کو نحو کے معمولی استعمالات ہی کا علم ہے اور نہ وہ آیاتِ قرآنی کے سیاق و سباق کا ہی کچھ درک رکھتے ہیں اور صرف جاہلانہ دعاوی پر دلیر نظر آتے ہیں۔

جن قوانینِ عربیت میں "اذ" اور "اذا" کے درمیان یہ فرق بیان کیا گیا ہے کہ "اذ" اگر فعل مستقبل پر بھی داخل ہو تب بھی "ماضی" کے معنی دیتا ہے اور "اذا" اگرچہ فعلِ ماضی پر بھی داخل ہو تب بھی مستقبل کے معنی دیا کرتا ہے ان ہی قوانین میں علماء معانی و بلاغت یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی گذرے ہوئے واقعہ کو اس طرح پیش کرنے کے لئے گویا وہ زمانۂ حال میں پیش آرہا ہے صیغۂ مستقبل سے تعبیر کر لیا کرتے ہیں یعنی اس کے لیے "اذ" کا استعمال جائز رکھتے بلکہ مستحسن سمجھتے اور اس کو "استحضار" اور "حکایۃ الحال" کہتے ہیں اور اسی طرح مستقبل میں ہونے والے ایسے واقعہ کو جس کے وقوع سے متعلق یہ یقین دلانا ہو کہ وہ ضرور ہو کر رہے گا اور ناممکن ہے کہ اس کے خلاف ہو سکے اکثر ماضی کے صیغہ سے تعبیر کرنا مستحسن سمجھتے بلکہ بلاغتِ تعبیر کے لحاظ سے ضروری اور مفیدِ یقین کرتے ہیں، کیونکہ اس طرح مخاطب اور سامع کے سامنے ہونے والے واقعہ کا نقشہ اس طرح آجاتا ہے گویا وہ ہو گذرا ہے اور یہ بھی "استحضار" ہی کی ایک صورت سمجھی جاتی ہے، دور کیوں جائیے، لفظ "اذ" کا استعمال مستقبل کے لیے خود قرآن عزیز میں متعدد مقامات پر ثابت ہے:۔

سورۂ انعام میں قیامت کے دن مجرموں کی کیا کیفیت ہوگی ۳۱ کا نقشہ کھینچتے ہوئے

کہا گیا ہے :-

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ	اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ وہ کھڑے کئے جائیں گے
فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ	آگ (جہنم) کے اوپر پس کہیں گے اے کاش کہ ہم لوٹا دیے
بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ	جائیں دنیا میں اور نہ جھٹلائیں ہم اپنے رب کی نشانیوں کو
الْمُؤْمِنِيْنَ (الانعام پ ۷ ع)	اور ہو جائیں ہم ایمان والوں میں سے۔

اور اسی سورۂ انعام میں روزِ قیامت مجرموں کی حالت کا اِس طرح ذکر کیا گیا ہے :-

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ	اور کاش کہ تو دیکھے، جب وہ اپنے پروردگار کے سامنے
قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا	کھڑے کیے جائیں گے تو (پروردگار) کہے گا کیا یہ حق نہیں
بَلٰى وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا	ہے؟ وہ کہیں گے قسم ہے پروردگار کی یہ (روزِ حشر) حق
الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ	اور سچ ہے، پس پروردگار کہے گا تو چکھو اس کے بدلہ میں
تَكْفُرُوْنَ (الانعام پ ۷ ع)	عذاب جو تم کفر کیا کرتے تھے۔

اور ان ہی مجرمین کی روزِ قیامت حالت کا نقشہ سورۂ سبا میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے :-

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ	اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ وہ (منکرین) گھبرائیں گے، پس نہیں
وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ	بھاگ سکیں گے اور پکڑے جائیں گے قریب سے اور
فَقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ (سبا پ ۲۲ ع)	کہیں گے ہم (اب) اس پر ایمان لے آئے۔

اور سورۂ سجدہ میں اِس حقیقت کو اِن الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے :-

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا	اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ مجرم اپنا سر نیچے ڈالے ہوئے۔
رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (السجدۃ پ ۲۱ ع)	ہوں گے اپنے رب کے سامنے۔

یہ اور اِسی قسم کے متعدد مقامات ہیں جن میں مستقبل کے واقعات کو ماضی کے ساتھ تعبیر کیا گیا اور اس لیے لفظ "اذ" کا استعمال مفید سمجھا گیا پس جس طرح ان مقامات میں "اِذْ وُقِفُوْا" "قَالَ" "قَالُوْا" "اِذْ فَزِعُوْا" "وَاُخِذُوْا" "اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا" تمام افعال لفظ "اِذْ" کے باوجود

مستقبل کے معنی دے رہے ہیں اسی طرح "اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی" کے استعمال کو مستقبل کے لیے سمجھئے اور جس طرح ان تمام مقامات کے سیاق و سباق دلالت کر رہے ہیں کہ ان واقعات کا تعلق روزِ قیامت سے ہے ٹھیک آیاتِ مائدہ کی زیرِ بحث آیات کا سیاق و سباق صراحت کر رہا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق قیامت کے دن سے ہے۔

قاعدۂ عربیت کی اس حقیقت افروز تحقیق کے بعد مسٹر لاہوری کی دوسری دلیل پر نظر ڈالیے تو وہ اس سے بھی زیادہ پُرلطف نظر آئے گی اس لیے کہ گذشتہ تحقیق سے یہ واضح ہو چکا کہ سورۂ مائدہ کی آیاتِ زیرِ بحث میں حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) کا جواب ہرگز اس بات پر مبنی نہیں ہے کہ اُن کو اپنی اُمت کی گمراہی کا علم نہیں ہوگا اور وہ اپنی لاعلمی ظاہر کریں گے، ایک مرتبہ ان آیات پر پھر غور کرو گے تو صاف نظر آئے گا کہ حضرتِ عیسٰی علیہ السلام کا اصل جواب صرف یہ ہے "مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ" اور اوّل و آخر باقی آیات ہیں یا جواب کے مناسبِ حال تمہید ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی جلالت و جبروت اور اپنی بیچارگی و درماندگی بلکہ عبودیت کا اظہار ہے جس میں ایک جلیل القدر پیغمبر کی شان کے مناسب حضرۃ القدس کے سامنے شہادت پیش کی گئی ہے، علاوہ ازیں اگر مسٹر لاہوری کا یہ قول صحیح مان لیں کہ حضرتِ عیسٰیؑ کے رفعِ سماوی تک نصاریٰ نے چونکہ تثلیث کا عقیدہ نہیں اختیار کیا تھا اس لیے انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ سوال کیا معنی رکھتا ہے "ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کیا العیاذ باللہ اس کا یہ مطلب نہ ہوا کہ خدا نے عیسٰی علیہ السلام کی اُمت پر جھوٹا الزام لگایا؟ پھر یہ کیا کم حیرت کی بات ہے کہ کادیانی اور لاہوری ایک جانب تو یہ کہہ رہے ہیں مگر اس کے قطعاً متضاد آئینۂ کمالاتِ میں کادیانی نے یہ کہا ہے کہ جب عیسٰی علیہ السلام کی رُوح کو یہ معلوم ہوا اور اس کو بتایا گیا کہ اس کی اُمت کس طرح شرک میں مبتلا ہو گئی تب عیسٰی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء کی، خدایا! تو میرا مثیل نازل فرماتا کہ میری اُمت اس شرک سے

نجات پائے اور تیری سچی پرستار بنے ؎ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

حقیقت یہ ہے کہ کادیانی اور لاہوری کی تفسیر کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی آیات کے مطالب قرآن کی زبان سے سُننا چاہتے ہیں بلکہ پہلے سے ایک باطل عقیدہ کو عقیدہ بناتے ہیں اور پھر اس کے سانچہ میں قرآن کو ڈھالنا چاہتے ہیں اور جب قرآن اس سانچہ میں ڈھلنے سے انکار کرتا ہے تو تحریف کے حربہ سے زبردستی اس پر مشقِ ستم کرنا چاہتے ہیں، مگر وہ ایسا کرتے وقت حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ قرآن اُمت کی ہدایت کے لیے رہتی دنیا تک امام الہدیٰ ہے۔ اس لیے کوئی "ملحد و زندیق" خواہ کتنی ہی تحریفِ معنوی کی کوشش کرے ہمیشہ ناکام اور خاسر رہے گا اور خود قرآنی اطلاقات ہی اس کے عقیدہ و فکر کے بطلان کے لیے ناطق ہوں گے بلکہ بمصداق "دروغ گو را حافظہ نہ باشد" وہ اکثر اپنے ہی متضاد اقوال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر اپنی کذب بیانی اور تفسیری افترا پر مُہر لگا لیتا ہے جس کی تازہ شہادت ابھی سطورِ بالا میں نقل ہو چکی ہے۔

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ	حیات و رفع مسیح (علیہ السلام) سے متعلق گذشتہ مباحث میں "توفی" کی حقیقت پر کافی روشنی پڑ چکی ہے اور سورۂ مائدہ کی آیاتِ

مسطورہ بالا کی تفسیر کے بھی تمام پہلو واضح ہو چکے ہیں، تاہم قرآن کے اعجازِ بلاغت اور اسلوبِ بیان کی لطافت سے مستفید ہونے کے لیے چند سطور اس مسئلہ پر بھی سپردِ قلم کر دینا مناسب ہے کہ اس مقام پر قرآن نے عیسیٰ (علیہ السلام) کے قیامِ ارضی کو "مادمت فیھم" سے اور کائناتِ ارضی سے انقطاعِ تعلقات کو "توفیتنی" سے کیوں تعبیر کیا۔

گذشتہ سطور میں لغت اور معانی کے حوالوں سے یہ تو ثابت ہو چکا کہ "توفی" کے حقیقی معنی "اخذ و تناول" (لے لینے اور قبضہ میں کر لینے) کے ہیں اور موت کے معنی میں بطور کنایہ اس کا استعمال ہوتا ہے اور یہ کہ کنایہ میں حقیقی معنی برابر ساتھ ساتھ رہتے ہیں مجاز کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ حقیقی معنی سے جدا ہو کر لفظ غیر موضوع لہٗ میں استعمال ہونے لگے، پس اگر

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق قرآن کا عقیدہ یہ ہوتا کہ اُن کو موت آچکی اور سوال و جواب کا یہ سلسلہ موت کے اسی وقت سے متعلق ہے نہ کہ قیامت کے دن سے تو پھر بلاغت و معانی کا تقاضا یہ تھا کہ اس موقع پر "حیات" اور "موت" ایک دوسرے کے متضاد الفاظ کو استعمال کیا جاتا تاکہ یہ حیثیت واضح ہو سکتی کہ سوال و جواب کا معاملہ "موت" کے ہم قریں ہے اور پھر لفظ "موت" کی صراحت اپنے مقابل لفظ "حیات" کی طالب ہوتی مگر قرآن نے ان دونوں الفاظ کی بجائے "مادُمْتُ فِیھِمْ" کو "حیوٰۃ" کی اور "توفّیٰ" کو "موت" کی جگہ استعمال کیا ہے تو یہ کس لئے اور کس مقصد سے یا بغیر کسی حکمت و مصلحت کے یہ اسلوب اختیار کر لیا؟ جمہور اُمت تو اس کا ایک ہی جواب رکھتی ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے دوسرے مقامات کی طرح اس مقام پر بھی اعجاز و ایجاز سے کام لیا ہے اور ان دو لفظوں میں وہ حضرتِ مسیح علیہ السلام کی زندگی، رفع، نزول اور موت تمام مراحل کو سمو دینا چاہتا ہے، وہ اگر یہ کہتا "ماحییتُ" "میں جب تک زندہ رہا" اور "فلمّا امتنی" "پس جب تو نے مجھ کو موت دے دی" تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھی عام حالات کے مطابق دو ہی مراحل پیش آئے ہیں "زندگی" اور "موت" ان دونوں مرحلوں کے درمیان کوئی خاص صورتِ حال پیش نہیں آئی، لیکن جبکہ یہ خلافِ واقعہ تھا اور اُن کی زندگی اور موت کے درمیان دو اہم مراحل پیش آچکے ہوں گے، ایک "ملاءِ اعلیٰ" کی جانب بقیدِ حیات رفع، اور دوسرے کائناتِ ارضی پر دوبارہ رجوع (نزول) اس لیے ازبس ضروری ہوا کہ حیات اور موت کی جگہ دو ایسے الفاظ اختیار کیے جائیں جو ان چاروں مراحل پر صادق آسکیں اور جبکہ متعدد مقامات پر حسبِ حال ان مراحل کی تفصیل بیان ہو چکی ہے تو اعجازِ بلاغت کا یہی تقاضا ہے کہ اب انکو ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔

صورتِ حال کا یہی نقشہ تھا جس کے لیے قرآنِ عزیز نے "ماحییت" کی جگہ "ما دمت فیھم" استعمال کیا، کہ یہ جملہ اختصار کے ساتھ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی زندگی کے

دونوں حصّوں پر حاوی ہو جائے، اس حصہ پر بھی جو ابتداءِ زندگی سے شروع ہو کر "رفع الی السماء" پر ختم ہوتا ہے اور اس حصہ پر بھی جو "نزولِ ارضی" سے شروع ہو کر "موت" پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور اسی طرح قرآن نے "فَلَمَّا اَمَتَّنِیْ" کا اسلوبِ بیان اختیار کیا تاکہ یہ جملہ بھی پہلے کی طرح باقی دونوں مرحلوں کو اپنے اندر سمو لے، اس مرحلہ کو بھی جو "رفع الی السماء" کی صورت میں پیش آیا اور اس مرحلہ کو بھی جو نزول کے بعد "موت" کی صورت میں نمودار ہوا کیونکہ موت سے تو صرف ایک ہی حقیقت ظاہر ہو سکتی تھی مگر "توفی" میں بیک وقت دونوں حقیقتیں موجود تھیں، حقیقی معنی کے لحاظ سے صرف "اخذ و تناول" اور کنایہ کے اعتبار سے اخذ و تناول کے ساتھ ساتھ "موت" جیسا کہ سطورِ بالا میں "کنایہ" اور "مجاز" کے باہمی فرق سے معلوم ہو چکا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) عرض کریں گے خدایا! جو وقت میں نے ان کے درمیان گذارا اس کے لیے تو بیشک میں شاہد ہوں لیکن "توفی" کے اوقات میں ان پر فقط تو ہی نگہبان رہا۔ باقی تیری شہادت تو ہر حالت میں ہر وقت ہر شے پر حاوی ہے

مسئلہ متنازعہ کی یہ پوری بحث اس سے قطع نظر کہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات کی تفسیر میں کیا ارشاد فرمایا ہے، لغت، معانی، بلاغت کے پیشِ نظر تھی ورنہ ان آیات کی تفسیر میں ایک مومن صادق کے لیے وہ صحیح مرفوع احادیث کافی ہیں جن کو محدثین نے بسندِ صحیح روایت کیا ہے۔ مثلاً مشہور محدث حافظ ابن عساکرؒ نے بروایت ابوموسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث نقل کی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

جب قیامت کا دن ہوگا تو تمام انبیاء علیہم السلام کو اور ان کی اُمتوں کو بُلایا جائے گا اور عیسیٰ علیہ السلام بھی بُلائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اوّل ان کے سامنے اپنی اُن نعمتوں کو شمار کرائے گا جو دنیا میں اُن پر نازل ہوتی رہیں اور عیسیٰ (علیہ السلام) ان سب کا اعتراف کریں گے اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا: ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ

اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ" تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) انکار فرمائیں گے پھر نصاریٰ بلائے جائیں گے اور ان سے سوال کیا جائے گا تو وہ دروغ بیانی کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہاں، عیسیٰؑ نے ہم کو یہی تعلیم دی تھی، یہ سُن کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر سخت خوف طاری ہو جائے گا، بدن کے بال کھڑے ہو جائیں گے اور خشیتِ الٰہی سے ان کا رُواں رُواں بارگاہِ صمدی میں سجدہ ریز ہو جائے گا اور یہ مدت ایک ہزار سال معلوم ہوگی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نصاریٰ کے خلاف حجت قائم کر دی جائیگی اور اُن کی خود ساختہ صلیب پرستی کا راز فاش کر دیا جائے گا اور پھر اُن کو جہنم میں جھونک دیے جانے کا حکم ہو جائے گا۔[1]

اور محدث ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے بسندِ صحیح یہ روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں "کہ اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن عیسیٰ (علیہ السلام) سے اُن کی اُمت کے متعلق سوال کرے گا تو اپنی جانب سے عیسیٰ علیہ السلام پر جواب بھی القاء کر دے گا" اور اس القاء کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰؑ پر القاء ہوگا کہ وہ یہ جواب دیں: "سُبْحَانَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ"[2]

اور صحیحین (بخاری و مسلم) اور سنن میں جو حدیثِ شفاعت منقول و مشہور ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح قیامت میں تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اُمتوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور معاملہ کے پیش آنے سے قبل خائف و ہراساں ہوں گے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان میں سے ایک ہوں گے اور اُن پر یہ خوف طاری ہو رہا ہوگا کہ جب ان سے اُمت کی مشرکانہ بدعت پر سوال ہوگا تو وہ درگاہِ صمدی میں کس طرح اُس سے عہدہ برآ ہو سکیں گے؟

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ سورۂ مائدہ۔ [2] ایضاً۔

الحاصل سورۂ مائدہ کی ان آیات کی تفسیر وہی صحیح ہے جو جمہور اُمت کی جانب سے منقول ہے اور کادیانی اور لاہوری کی تفسیر بالرائے الحاد و زندقہ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

حضرت مسیحؑ کی دعوتِ اصلاح اور بنی اسرائیل کے فرقے

گذشتہ مباحث میں پڑھ چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو انجیل عطا کی تھی اور یہ الہامی کتاب دراصل توراۃ کا تکملہ تھی یعنی حضرت مسیحؑ کی تعلیمی اساس اگرچہ توراۃ ہی پر قائم تھی مگر یہود کی گمراہیوں مذہبی بغاوتوں اور سرکشیوں کی وجہ سے جن اصلاحات کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی معرفت انجیل کی شکل میں ان کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ حضرت مسیحؑ کی بعثت سے پہلے یہود کی اعتقادی اور عملی گمراہیاں اگرچہ بے شمار حد تک پہنچ چکی تھیں اور حضرت مسیحؑ نے مبعوث ہو کر ان سب کی اصلاح کے لیے قدم اٹھایا، تاہم چند اہم بنیادی باتیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ اصلاح تھیں جن کی اصلاح کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام بہت زیادہ سرگرم عمل رہے۔

(۱) یہود کی ایک جماعت کہتی تھی کہ انسان کے اعمالِ نیک و بد کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے باقی قیامت، آخرت، آخرت میں جزا و سزا، حشر و نشر، یہ سب باتیں غلط ہیں یہ "صدوقی" تھے۔

(۲) دوسری جماعت اگرچہ ان تمام چیزوں کو حق سمجھتی تھی مگر ساتھ ہی یہ یقین رکھتی تھی کہ وصول الی اللہ کے لیے ازبس ضروری ہے کہ لذاتِ دنیا اور اہلِ دنیا سے کنارہ کش ہو کر "زہادت" کی زندگی اختیار کی جائے چنانچہ وہ بستیوں سے الگ خانقاہوں اور جھونپڑیوں میں رہنا پسند کرتے تھے مگر یہ جماعت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی بعثت سے کچھ پہلے اپنی یہ حیثیت بھی کھو چکی تھی اور اب ترکِ دنیا کے پردہ میں دنیا کی ہر قسم کی گندگی میں آلودہ نظر آتی تھی، ظاہر رسم و طریق زاہدوں کا سا ہوتا مگر خلوت کدوں میں وہ سب کچھ نظر آتا جن سے رندانِ بادہ خوار بھی ایک مرتبہ حیا سے آنکھیں بند کر لیں، یہ "فریسی" کہلاتے تھے۔

(۳) تیسری جماعت مذہبی رسوم اور خدمتِ ہیکل سے متعلق تھی لیکن اُن کا بھی یہ حال تھا کہ جن رسوم اور خدمات کو لوجہ اللہ کرنا چاہیے تھا اور جن اعمال کے نیک نتائج خلوص پر مبنی تھے ان کو تجارتی کاروبار بنا لیا تھا اور جب تک ہر ایک رسم اور خدمتِ ہیکل پر بھینٹ اور نذر نہ لے لیں قدم نہ اُٹھائیں حتیٰ کہ اس مقدس کاروبار کے لیے انھوں نے توراۃ کے احکام تک میں تحریف کر دی تھی "یہ کاہن" تھے۔

(۴) چوتھی جماعت ان سب پر حاوی اور مذہب کی اجارہ دار تھی، اِس جماعت نے عوام میں آہستہ آہستہ یہ عقیدہ پیدا کر دیا تھا کہ مذہب اور دین کے اصول و اعتقادات کچھ نہیں ہیں مگر وہ جن پر وہ صاد کر دیں اُن کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیں، احکامِ دین میں اضافہ یا کمی کر دیں۔ جس کو چاہیں جنت کا پروانہ لکھ دیں اور جس کو چاہیں جہنم کی سند تحریر کر دیں۔ خُدا کے یہاں اُن کا فیصلہ اٹل اور ان مٹ ہے غرض بنی اسرائیل کے "ارباباً من دون اللہ" بنے ہوئے تھے۔ اور تورات کی لفظی اور معنوی ہر قسم کی تحریف میں اِس درجہ جری تھے کہ اس کو دنیا طلبی کا مستقل سرمایہ بنا لیا تھا اور عوام و خواص کی خوشنودی کے لیے ٹھہرائی ہوئی قیمت پر احکامِ دین کو بدل ڈالنا ان کا مشغلۂ دینی تھا یہ "احبار" یا "فقیہ" تھے۔

یہ تھیں وہ جماعتیں اور یہ تھے اُن کے عقائد و اعمال جن کے درمیان حضرتِ مسیح (علیہ السلام) مبعوث ہوئے اور جن کی اصلاحِ حال کے لیے اُن کی بعثت ہوئی انھوں نے ہر ایک جماعت کے فاسد عقائد و اعمال کا جائزہ لیا، رحم و شفقت کے ساتھ ان کے عیوب و نقائص پر نکتہ چینی کی، ان کو اصلاحِ حال کے لیے ترغیب دی اور ان کے عقائد و افکار اور ان کے اعمال و کردار کی نجاستوں کو دور کر کے ان کا رشتہ خالقِ کائنات اور ذاتِ واحد کے ساتھ دوبارہ قائم کرنے کی سعی کی۔ مگر ان بدبختوں نے اپنے اعمالِ سیاہ کی اِصلاح سے یکسر انکار کر دیا اور نہ صرف یہ بلکہ اُن کو "مسیحِ ضلالت" کہہ کر اُن کی دعوتِ حق و ارشاد کے

دشمن اور ان کے خلاف سازشیں کر کے اُن کی جان کے درپے ہو گئے۔

اناجیلِ اربعہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) پر جو انجیل نازل ہوئی تھی کیا موجودہ چاروں انجیلیں وہی ہیں یا یہ حضرتِ مسیحؑ کے بعد کی تصانیف ہیں؟ اس کے متعلق تمام اہلِ علم کا جن میں نصاریٰ بھی شامل ہیں، اتفاق ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی انجیل نہیں ہے اور نہ اس کا ترجمہ ہے لیکن پھر ان موجودہ انجیلوں کے متعلق عیسائی کیا کہتے ہیں اور ناقدین کی رائے کیا ہے۔ یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے:۔

یہ بات بہرحال تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ چاروں انجیلوں کے متعلق نصاریٰ کے پاس کوئی ایسی سند موجود نہیں جس کی بنا پر وہ یہ کہہ سکیں کہ اُن کی روایات کا سلسلہ یا ان کی ترتیب و تالیف کا زمانہ حضرتِ مسیحؑ یا اُن کے شاگردوں (حواریوں) تک پہنچتا ہے نہ اس کیلئے کوئی مذہبی سند ہے اور نہ تاریخی، بلکہ اس کے خلاف خود عیسائیت کی مذہبی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک عیسائیوں میں اکیس۲۱ سے زیادہ انجیلیں الہامی یقین کی جاتی اور رائج و معمول بہا تھیں، لیکن ۳۲۵ء میں نائیسیا کی کونسل نے ان میں سے صرف چار کو منتخب کر کے باقی کو متروک قرار دیدیا اور سخت حیرت کا مقام ہے کہ کونسل کا یہ انتخاب کسی تاریخی اور علمی بُنیاد پر نہیں ہوا بلکہ ایک طرح کی فال نکالی گئی اور اس کو الہامی اشارہ تسلیم کر لیا گیا، چنانچہ ان اکیس۲۱ سے زائد انجیلوں میں سے بعض یورپ کے قدیم کتب خانوں میں پائی گئی ہیں مثلاً انیسویں صدی میں ڈیٹیکان کے مشہور کتب خانہ سے متروک اناجیل کا ایک نسخہ برآمد ہوا تھا جس میں موجودہ چاروں انجیلوں سے بہت کچھ زائد موجود ہے، موجودہ نسخوں میں سے سینٹ لوقا کی انجیل میں خصوصیت کے ساتھ حضرتِ مسیحؑ کی پیدائش کا واقعہ تفصیل سے درج ہے لیکن سورۂ مریم میں قرآنِ عزیز نے اِس واقعہ کو جس طرح حضرتِ مریمؑ کی پیدائش اور ھیکل میں تربیت کے ذکر سے شروع کیا ہے نہ لوقا کی انجیل میں اس کا ذکر ہے اور نہ باقی تینوں انجیلوں میں،

ویٹیکان کے اس نسخہ میں یہ واقعہ ٹھیک سورۂ مریم میں مذکور واقعہ کی طرح درج ہے۔[1]

اسی طرح سولہویں صدی میں روما کے مشہور پوپ سکٹس (SKITS) کے قدیم کتب خانہ میں ایک اور متروک انجیل کا نسخہ برآمد ہوا جس کا نام انجیل برنابا ہے، یہ نسخہ پوپ کے مقرب لاٹ پادری فرامرینو نے پڑھا اور پوپ کی اجازت کے بغیر کتب خانہ سے چرا لایا۔ چونکہ اس میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کثرت سے واضح اور صاف بشارتیں موجود تھیں حتیٰ کہ "احمد" نام تک مذکور تھا، نیز الوہیت مسیح کے خلاف عقیدہ کی تعلیم پائی جاتی تھی اس لیے وہ لاٹ پادری مسلمان ہوگیا، حال ہی میں اس کا عربی ترجمہ مصر میں علامہ سید رشید رضا مرحوم نے المنار پریس سے شائع کیا ہے جو قابلِ مطالعہ ہے، ڈاکٹر سعادہ نے اس کے مقدمہ میں جو قابلِ قدر علمی تحقیق پیش کی ہے اُس میں ہے کہ اس انجیل کا پتہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس تاریخی منشور (حکمنامہ) سے چلتا ہے جو خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عیسائیوں کے پوپ گلیسیوس کی جانب سے کلیساؤں کے نام بھیجا گیا تھا اور جس میں ان کتابوں کے نام درج تھے جن کا پڑھنا پڑھانا عیسائیوں پر حرام کیا گیا تھا ان ہی میں انجیل برنابا کا نام بھی شامل تھا۔

علاوہ ازیں محققینِ یورپ بھی آج اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے بعد ابتدائی تین صدیوں میں ایک سو سے زائد انجیلیں پائی جاتی تھیں جو بعد میں چار کو چھوڑ کر باقی متروک کر دی گئیں اور کلیسہ کے فیصلہ کے مطابق اُن کا پڑھنا حرام کر دیا گیا اس لیے آہستہ آہستہ وہ سب مفقود ہوتی چلی گئیں اور کہتے ہیں کہ ان مفقود نسخوں میں ایک مشہور انجیل، انجیل ایگنٹس (انجیل اغنطسی) بھی تھی جو اَب ناپید ہے۔

نیز یہ بات بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے کہ سینٹ پال (پولوس رسول) کے جو خطوط ہیں اور جن پر موجودہ عیسائیت کی بُنیادیں قائم ہیں اُن کے مطالعہ سے جگہ جگہ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگوں کو خبردار کرتا اور ڈراتا ہے کہ وہ ان انجیلوں کی جانب توجہ نہ دیں جو مسیحؑ

[1] ترجمان القرآن جلد دوم۔

کے نام کی بجائے دوسرے ناموں سے منسوب ہیں کیونکہ مجھ کو روح القدس نے اسی کے لیے مامور کیا ہے کہ میں انجیلِ مسیحؑ کی حمایت کروں، اسی کو اُسوہ بناؤں اور اس کی تعلیم کو تمام عیسائی دنیا میں پھیلاؤں، چنانچہ حسب ذیل جملے اس کی صراحت کرتے ہیں کہ اس کے نزدیک مسیحؑ کی انجیل عیسائیوں میں متروک ہو چکی تھی اور بعد کی بے سند انجیلوں کا عام رواج ہو گیا تھا اور ان ہی میں سے یہ چار ہیں جو نا لیسیا کی کونسل نے بغیر کسی سند کے فال کے ذریعہ صحیح تسلیم کر لیں۔

اب ان چار کا حال بھی سُنیے۔ ان میں سے سب سے قدیم متّی کی انجیل تسلیم کی جاتی ہے، بایں ہمہ اس کے متعلق نصاریٰ میں سے علماء متقدمین تو بالاتفاق اور علماء موجودہ میں سے اکثر اس کے قائل ہیں کہ موجودہ انجیلِ متّی اصل نہیں ہے بلکہ اس کا ترجمہ ہے اس لیے کہ اصل کتاب عبرانی میں تھی جو اب ناپید ہے اور ضائع ہو گئی لیکن یہ اصل کا ترجمہ ہے یا اس میں بھی تحریف ہوئی ہے اس کے متعلق کوئی تاریخی سند موجود نہیں، حتیٰ کہ مترجم کا نام تک معلوم نہیں اور نہ یہ پتہ کہ کس زمانہ میں یہ ترجمہ ہوا اور مشہور عیسائی عالم جرجیس زوبن الفتوحی اللبنانی نے اپنی کتاب میں تصریح کی ہے کہ متّی نے اپنی انجیل بیت المقدس میں بیٹھ کر ۳۹ء میں عبرانی میں تصنیف کی تھی جیسا کہ مقدس ایرونیموس نے کہا ہے کہ اوسیبوس نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ متّی کی انجیل کا یونانی ترجمہ اصل نہیں ہے اور جب بانیتوس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان جا کر عیسائیت کی تبلیغ کرے تو اس نے متّی کی انجیل کو عبرانی میں مکتوب اسکندریہ کے کتب خانۂ قیصر میں محفوظ دیکھا تھا مگر وہ نسخہ مفقود ہو گیا اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانہ میں کس شخص نے یونانی زبان میں موجودہ ترجمہ کو روشناس کرایا۔[1]

دوسری انجیل مرقس کی ہے، اس کے متعلق مشہور عیسائی عالم پطرس گواماگ اپنی

---

[1] الفارق بین المخلوق والخالق جلد اوّل ص ۲۰ ماخوذ از کتاب جرجیس زوبن لبنانی مطبوعہ بیروت۔

کتاب مروج الاخبار فی تراجم الابرار میں مرقس کی سوانح حیات پر لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ نسلاً یہودی لاوی اور پطرس حواری عیسیٰ (علیہ السلام) کا شاگرد تھا۔ رومیوں نے جب عیسائیت اختیار کرلی تو اُن کے مطالبہ پر یہ انجیل تصنیف کی یہ الوہیت مسیح کا منکر تھا اور اس نے اپنی انجیل میں اس حصہ کو بھی نہیں لیا جس میں حضرت مسیح (علیہ السلام) پطرس کی مدح کرتے ہیں، یہ ۶۸ء میں اسکندریہ کے قید خانہ میں قتل ہوا، بُت پرستوں نے اس کو قتل کردیا[1] اور عیسائی دنیا کو اِس بارے میں اختلاف ہے کہ مرقس کی انجیل کب تصنیف ہوئی چنانچہ الفارق کے مصنف مرشد الطالبین ص۱۷۰ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ علماء نصاریٰ کا خیال یہ ہے کہ یہ پطرس کی نگرانی میں ۶۱ھ میں تصنیف ہوئی۔[2]

تیسری انجیل سینٹ لوقا کی انجیل ہے جس قدر اختلاف علماء نصاریٰ میں متی کی انجیل سے متعلق ہے اس سے بھی زیادہ لوقا کی انجیل کی صحت وعدم صحت کے متعلق اختلاف ہے چنانچہ الفارق کے مصنف نے اس سلسلہ میں خود علماء نصاریٰ کے ہی اقوال نقل کیے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ الہامی کتاب نہیں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مسٹر گڈل اپنے رسالۃ الہام میں دعویٰ کرتا ہے کہ لوقا کی انجیل الہامی نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ لوقا نے خود اپنی انجیل کی ابتداء میں یہ لکھا ہے کہ یہ (انجیل) اس نے ثاوفیلس کے ساتھ خط وکتابت کی بناء پر لکھی ہے، وہ اس کو مخاطب کرکے لکھتا ہے کہ مسیح کی باتیں جن لوگوں نے آنکھوں سے دیکھی تھیں انھوں نے ہم تک جس طرح پہنچائی ہیں ان کو بہت سے لوگ ہم سے نقل کررہے ہیں اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کو خود ہی صحیح طریقہ پر جمع کردوں تاکہ تم کو صحیح حقیقت معلوم ہوجائے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حضرت مسیح کا زمانہ نہیں پایا، اور محققین نصاریٰ یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ لوقا کی انجیل مرقس کی انجیل کے بعد وجود میں آئی ہے اور پطرس اور پولوس کے مرنے کے بعد تصنیف کی گئی ہے۔[3]

---

[1] قصص الانبیاء للنجار۔ [2] الفارق ص ۳۱۶۔ [3] قصص الانبیاء للنجار ص ۴۷۷۔ ۴۷۹۔

اصل بات یہ ہے کہ لوقا انطاکیہ میں طبابت کرتا تھا، اس نے مسیحؑ کو نہیں دیکھا اور مسیحیت کو سینٹ پال (پولوس) سے سیکھا ہے اور پولوس کے متعلق یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ دراصل متعصب یہودی اور عیسائیت کا بدترین دشمن تھا اور نصاریٰ کے خلاف علی الاعلان اپنی جدوجہد جاری رکھتا تھا۔ مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کی ہمہ قسم کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود مسیحیت کی ترقی ہوتی جارہی ہے اور روکے نہیں رُکتی تب اس نے یہودیانہ مکر و فریب سے کام لیا اور اعلان کیا کہ عجب معجزہ ہوا میں بحالتِ صحت تھا کہ ایک دَم اِس طرح زمین پر گرا جیسا کہ کوئی کُشتی میں پچھاڑ دیتا ہے، اس حالت میں حضرتِ مسیحؑ نے مجھ کو چھُوا اور پھر سخت زجر و توبیخ کی کہ آئندہ تو ہرگز میرے پیروؤں کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنا پس میں اُسی وقت حضرتِ مسیحؑ پر ایمان لے آیا اور پھر حضرتِ مسیحؑ کے حکم سے میں مسیحی دُنیا کی خدمت کے لیے مامور ہوگیا، انھوں نے مجھ کو فرمایا کہ میں لوگوں کو مسیحؑ کی انجیل کی بشارت سُنا دوں اور اس کے اتباع کی ترغیب دوں چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ "کلیسہ" پر ایسا قبضہ کیا کہ دینِ عیسوی کی اصل صداقتوں کو مٹا کر بدعتوں اور بُرائیوں کا مجموعہ بنا دیا، الوہیتِ مسیحؑ، تثلیث و ابنیت اور کفارہ کی بدعت ایجاد کر کے مسیحیت کو وثنیت میں تبدیل کر دیا اور شراب، مُردار اور خنزیر سب کو حلال بنا دیا۔ یہی وہ مسیحیت ہے پولوس کے صدقہ میں جس سے آج دنیا روشناس ہے، اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ پولوس کے شاگرد لوقا کی انجیل الہامی انجیل ہے اور جیرم کہتا ہے کہ بعض قدیم علماءِ نصاریٰ اس کے قائل ہیں کہ لوقا کی انجیل کے ابتدائی دو باب الہامی نہیں الحاقی ہیں کیونکہ یہ اس نسخہ میں موجود نہیں ہیں جو مارسیون فرقہ کے ہاتھوں میں ہے اور مشہور نصرانی عالم اکہارن لکھتا ہے کہ لوقا کی انجیل کے باب ۲۲ آیات ۴۷ - ۴۳ الحاقی ہیں، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ معجزات سے متعلق جو بیان ہے اس میں کذب بیانی اور شاعرانہ مُبالغہ سے کام لیا گیا ہے جو غالباً کاتب کی جانب سے اضافہ ہیں لیکن اب

صدق کا کذب سے امتیاز حد درجہ دشوار ہے اور کلیمنٹس .... لکھتا ہے کہ متی اور مرقس کی انجیلیں بہت جگہ آپس میں مخالف اور متضاد واقعات کی حامل ہیں لیکن جس معاملہ میں دونوں کا اتفاق ہو اس کو لوقا کی انجیل کے بیان پر ترجیح حاصل[1] ہے اور یہ واضح رہے کہ لوقا کی انجیل میں بیس سے زیادہ مواقع پر متی کی انجیل سے اضافہ ہے اور مرقس کی انجیل سے تو اس سے بھی کہیں زیادہ[2]۔ پس ان تمام دلائل سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ لوقا کی انجیل ہرگز الہامی نہیں ہے اور نہ کسی حواری کی تصنیف ہے۔

چوتھی انجیل یوحنا کی ہے اس کے متعلق نصاریٰ کا عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے محبوب شاگرد یوحنا زبدی کی ہے، زبدی صیاد، یوحنا کے والد کا نام تھا، جلیل کے بیت صیدا میں ولادت ہوئی اور حواریِ عیسیٰ (علیہ السلام) کا شرف حاصل ہوا اور نصاریٰ میں مشہور بارہ حواریوں میں سے سب سے زیادہ ان ہی کو تقدیس حاصل ہے۔ جرجیس زدبیں اللبنانی لکھتا ہے کہ جس زمانہ میں شیرنیطوس اور بیسوں اور ان کی جماعت اپنے عقیدہ کی تشہیر کر رہی تھی کہ الوہیت مسیح کا عقیدہ باطل ہے وہ بشر تھے اور حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے اور حضرت مریمؑ سے قبل وہ عالم وجود میں نہیں تھے اُس زمانہ میں ۹۶ء میں پادریوں، لاٹ پادریوں کی مجلس مشاورت ہوئی اور انھوں نے یوحنا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست پیش کی کہ وہ حضرت مسیحؑ کی باتیں تحریر کریں اور جو باتیں دوسری انجیلوں میں پائی جاتی ہیں ان کے سوا جو کچھ معلوم ہو وہ لکھیں خصوصیت سے الوہیت مسیح کا مسئلہ ضرور لکھیں تاکہ شیرنیطوس وغیرہ کی جماعت کے خلاف ہمارے ہاتھ مضبوط ہوں تب یوحنا اُن کی بات نہ ٹال سکے اور یہ انجیل لکھنے پر مجبور ہوئے[3]۔ مگر اس کے باوجود مسیحی علماء زمانۂ تصنیف کی تعیین میں مختلف نظر آتے ہیں، بعض کہتے ہیں ۶۵ء میں تالیف ہوئی اور بعض ۹۶ء اور بعض ۹۸ء میں تصنیف ہونا بیان کرتے ہیں۔

---

[1] قصص الانبیاء ص ۴۷۷۔ [2] ایضاً ص ۴۷۷۔ [3] ایضاً ص ۴۷۷۔

مگر ان کے مقابلہ میں ان مسیحی علماء کی تعداد کم نہیں ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یوحنا کی انجیل، حواری یوحنا کی تصنیف ہرگز نہیں ہے چنانچہ کیتھولک ہیرالڈ جلد ۲ میں پروفیسر لن سے منقول ہے کہ انجیلِ یوحنا از ابتدا تا انتہا مدرسہ اسکندریہ کے ایک طالب علم کی تصنیف ہے اور برفش نیدر لکھتا ہے کہ انجیلِ یوحنا اور رسائلِ یوحنا ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیحؑ کے شاگرد یوحنا کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کسی شخص نے دوسری صدی کے اوائل میں اس کو تصنیف کرکے اس لیے یوحنا کی جانب منسوب کر دیا تاکہ وہ لوگوں میں مقبول و مشہور بن جائے اور صاحب الفارق کہتے ہیں کہ مشہور مسیحی عالم کرزٹیس کا بیان ہے کہ یہ انجیل شروع میں بیس ابواب پر مشتمل تھی بعد میں افاس کے کنیسہ نے اس میں اکیسویں باب کا اضافہ کر دیا جبکہ یوحنا کا انتقال ہو چکا تھا۔[۲] ان حوالجات سے یہ بخوبی آشکارا ہوتا ہے کہ بلاشبہ یوحنا حواری کی انجیل نہیں ہے اور صرف اس مقصد سے تصنیف کرکے یوحنا کی جانب منسوب کی گئی کہ الوہیتِ مسیحؑ کے عقیدہ کنیسہ کو قوت پہنچائی جائے اور اصلاحِ عقیدہ کی جو آواز کبھی کبھی مسیحی دنیا میں اٹھتی تھی اُس کو دبایا جائے۔

چہارگانہ اناجیل کے متعلق مسطورہ بالا مختصر تنقیدات کے علاوہ ان کے الہامی نہ ہونے کی دو واضح دلائل یہ بھی ہیں کہ ان چاروں انجیلوں میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کی زندگی کے وقائع درج ہیں حتیٰ کہ نصاریٰ کے زعم کے مطابق ان کی گرفتاری، صلیب، قتل، مرکر جی اُٹھنے اور حواریوں پر ظاہر ہونے وغیرہ تک کے حالات بھی موجود ہیں پس اگر یہ اناجیل انجیلِ مسیحؑ یا اس کا کوئی حصہ ہوتیں تو ان میں ان باتوں کا قطعاً تذکرہ نہیں ہونا چاہئے تھا وہ واقعات تو مسیحؑ کے بعد اُن کے شاگرد جمع کرتے اور اُن کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہوتی نہ کہ وہ کتاب اللہ کہلانے کے مستحق ہوتے اور یہ کہ جس طرح ان انجیلوں کے مصنفین کے بارہ میں اختلاف ہے اسی طرح ان تصنیفات کے باہم روایاتِ واقعات میں بھی تناقض اور سخت اختلاف پایا جاتا ہے یعنی بعض معجزات و عجیب واقعات ایسے ہیں جو

[۱] مطبوعہ ۱۸۴۳ء۔ [۲] الفارق ص ۳۴۲ - ۳۴۱۔

ایک انجیل میں پائے جاتے ہیں اور دوسری انجیل میں ان کا اشارۃ تک نہیں ہے یا بعض میں ایک واقعہ جس طرح مذکور ہے دوسری میں کچھ زیادتی یا کمی کے ساتھ ایسے طریقہ پر بیان ہوا ہے کہ پہلی انجیل کے بیان میں اور اس میں صریح تضاد اور خلاف نظر آتا ہے مثلاً صلیبِ مسیح علیہ السلام کا واقعہ اناجیل میں تضادِ بیان کے ساتھ منقول ہے۔

یہ بات بھی کم حیرت کے لائق نہیں ہے کہ یہ اناجیلِ اربعہ جن جن زبانوں میں منقول ہوئی ہیں ان کی عبارات وکلمات کے بقاء وتحفظ کی کبھی پرواہ نہیں کی گئی بلکہ ایک ہی زبان کے مختلف ایڈیشنوں اور اشاعتوں میں بہ کثرت الفاظ اور جملوں کی تبدیلی، کمی اور بیشی موجود ہے خصوصاً جن مقامات پر علماءِ نصاریٰ اور علماءِ اسلام کے درمیان بشارات کے سلسلہ میں یہ بحث آگئی ہے کہ ان کا مصداق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا حضرتِ مسیح یا کوئی اور نبی، نیز جن مقامات پر الوہیتِ مسیح کی صراحت میں فرق پڑتا نظر آتا ہو اُن کو کافی تختۂ مشق بنایا جاتا رہا ہے ـــــ اگر تحریفاتِ لفظی ومعنوی اور تضادِ بیان کی تفصیلات و تشریحات کو بہ نظرِ وسیع مطالعہ کرنا ہو تو اس کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی اظہار الحق وحافظ ابن قیم کی ہدایۃ الحیاریٰ، باجرجی زادہ کی الفارق بین المخلوق والخالق، اور مولانا آلِ نبی امروہی کی اظہارِ حق لائقِ دید کتابیں ہیں۔

غرض موجودہ چاروں انجیلیں الہامی انجیلیں نہیں ہیں نہ ان کے الہامی ہونے کی روایتی سند ہے اور نہ تاریخی، نہ اُن کے مصنفین کے متعلق قطعی اور یقینی علم حاصل ہے اور نہ زمانہائے تصانیف ہی متعین ہیں بلکہ اس کے خلاف پولوس کے بیانات، ان کتابوں کی تاریخی حیثیت مضامین ومطالب کا باہمی تضاد وتغیر اسی پر شاہد ہیں کہ یہ ہرگز انجیلِ مسیح یا اس کا حصہ نہیں ہیں اور یہ کہ انجیلِ مسیح نصاریٰ کے ہی ہاتھوں اوّل تحریفِ لفظی ومعنوی کا شکار ہوئی اور اس کے بعد مفقود ہوگئی بلکہ ان چہارگانہ انجیلوں میں سے کوئی بھی اصل نہیں ہے بلکہ یونانی اور اس سے منقول دوسری زبانوں کے تراجم ہیں جو تبدیلی وتغیر

اور نقص و ازدیاد کا برابر شکار ہوتے رہے ہیں اور صرف یہی نہیں کہ یہ اناجیل اربعہ انجیلِ مسیحؑ نہیں ہیں بلکہ کسی علمی تاریخی اور مذہبی سند سے اُن کا شاگردانِ مسیحؑ کی تصنیف ہونا بھی ثابت نہیں ہے بلکہ بعد کے مصنفین کی تصانیف ہیں البتہ ان تراجم میں مواعظ و نصائح اور مقاماتِ حکمت کے سلسلہ میں ایک حصہ ایسا ضرور ہے جو حضرت مسیحؑ (علیہ السلام) کے ارشاداتِ عالیہ سے ماخوذ ہے اس لیے نقل میں کہیں کہیں اصل کی جھلک نظر آجاتی ہے۔

قرآن اور انجیل قرآنِ عزیز کی بُنیادی تعلیم یہ ہے کہ جس طرح خدا ایک ہے اسی طرح اُس کی صداقت بھی ایک ہی ہے اور وہ کبھی کسی خاص قوم، خاص جماعت اور خاص گروہ کی وراثت نہیں رہی بلکہ ہر قوم اور ہر ملک میں خدا کی رشد و ہدایت، کا پیغام ایک ہی احساس و بنیاد پر قائم رہتے ہوئے اس کے سچے پیغمبروں یا ان کے نائبوں کے ذریعے ہمیشہ دنیا کے لیے راہِ مستقیم کا داعی اور منادر ہا ہے اور اسی کا نام "صراطِ مستقیم" اور "اسلام" ہے اور قرآن اِسی بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانے آیا ہے اور یہی وہ آخری پیغام ہے جس نے تمام مذاہبِ ماضیہ کی صداقتوں کو اپنے اندر سمو کر کائناتِ ارضی کی ہدایت کا بیڑا اُٹھایا ہے اور اس لیے اب اس کا انکار گویا خدا کی تمام صداقتوں کا انکار ہے۔ اِسی بنیادی تعلیم کے پیشِ نظر اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی عظمتِ شان کو سراہا اور یہ اعتراف کیا کہ بلاشبہ انجیل الہامی کتاب اور خدا کی کتاب ہے لیکن ساتھ ہی جگہ جگہ یہ بھی بہ دلائل بتلایا کہ علماءِ اہلِ کتاب نے ں کی سچی تعلیم کو مٹا ڈالا بدل ڈالا اور ہر قسم کی تحریف کر کے اس کی تعلیم کو شرک و کفر کی تعلیم بنا دیا۔ مگر بعض بعض مقامات پر اہلِ کتاب کو توراۃ و انجیل کے خلاف عمل پر ملزم بناتے ہوئے موجودہ تورات و انجیل کے حوالے بھی دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت اصل نسخے بھی اگرچہ محرّف شکل میں ہی کیوں نہوں پائے جاتے تھے۔ بہرحال اُس وقت بھی یہ دونوں کتابیں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفات سے اِس درجہ مسخ ہو چکی تھیں کہ وہ توراتِ موسیٰ اور انجیلِ مسیحؑ کہلانے کی مستحق نہیں رہی تھیں۔

چنانچہ قرآن نے اصل کتابوں کی عظمت اور اہلِ کتاب کے ہاتھوں اُن کی تحریف اور ان کا مسخ دونوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے:-

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۙ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ (آل عمران پ ۳ ع)	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ نے تجھ پر کتاب کو اُتارا حق کے ساتھ جو تصدیق کرنے والی ہے اُن کتابوں کی جو اس کے سامنے ہیں اور اتارا اس نے تورات اور انجیل کو (قرآن سے) پہلے جو ہدایت ہیں لوگوں کے لیے اور اتارا فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی)
وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ (آل عمران پ ۳ ع)	اور سکھاتا ہے وہ کتاب کو، حکمت کو، تورات کو، انجیل کو۔
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (آل عمران پ ۳ ع)	اے اہلِ کتاب! تم کس لیے ابراہیمؑ کے بارے میں جھگڑتے ہو اور حال یہ ہے کہ تورات اور انجیل کا نزول نہیں ہوا، مگر ابراہیمؑ کے بعد، پس کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔
وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (المائدہ، پ ۶، ع)	اور پیچھے بھیجا ہم نے عیسیٰ ابن مریمؑ کو جو تصدیق کرنے والا ہے اس کتاب کی جو سامنے ہے تورات اور دی ہم نے اس کو انجیل جس میں ہدایت اور نور ہے اور جو اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرتی ہے اور سرتاسر ہدایت اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کے لیے اور چاہیے کہ اہلِ انجیل اس کے مطابق فیصلہ دیں جو ہم نے انجیل میں اتار دیا ہے اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے موافق فیصلہ نہیں دیتا پس یہی لوگ فاسق ہیں۔
وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ	اور اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھتے

وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝ (المائدہ پ ۷)

(تحریف کرکے اُن کو مسخ نہ کر ڈالتے) اور اس کو قائم رکھتے جو اُن کی جانب ان کے پروردگار کی جانب سے ہوا ہے تو البتہ وہ (فارغ البالی کے ساتھ) کھاتے اپنے اُوپر سے اور اپنے نیچے سے بعض اُنمیں میانہ رو صلاح کار ہیں اور اکثر اُن کے بدعمل ہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۝ (المائدہ پ ۷)

(اے محمدؐ) کہدیجئے: اے اہلِ کتاب تمہارے لیے ٹکنے کی کوئی جگہ نہیں ہے جب تک تورات اور انجیل اور اس شے کو جس کو تمہارے پروردگار نے تم پر نازل کیا قائم نہ کرو (تاکہ اس کا نتیجہ قرآن کی تصدیق نکلے)

وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ (المائدہ پ ۷)

اور جب میں نے تجھ کو (اے عیسیٰؑ) لکھائی کتاب حکمت تورات اور انجیل۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ۔ (الاعراف پ ۹)

(نکوکار) وہ شخص ہیں جو پیروی کرتے ہیں رسول کی جو نبی اُمّی ہے اور جس کا ذکر اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (توبہ پ ۱۱)

بلاشبہ اللہ نے خرید لیا ہے مومنوں سے ان کی جانوں اور اُن کے مالوں کو اس بات پر کہ ان کیلیے جنت ہے وہ اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں پس قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں اُن کیلیے اللہ کا وعدہ سچا ہے جو تورات اور انجیل میں کیا گیا ہے۔

غرض یہ مدح و منقبت ہے اس تورات اور انجیل کی جو تورات موسیٰ اور انجیل عیسیٰ کہلانے کی مستحق اور حقیقت کتاب اللہ تھیں لیکن یہود و نصاریٰ نے ان الہامی کتابوں کے ساتھ

کیا معاملہ کیا۔ اس کا حال بھی قرآن ہی کی زبان سے سُنیے :-

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ پ ۱ ع ۹)	کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے حالانکہ اُن میں ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سُنتا تھا پھر اُس کو بدل ڈالتا تھا باوجود اس بات کے کہ وہ اُس کے مطالب کو سمجھتا تھا اور دیدہ و دانستہ تحریف کرتے تھے۔
فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝ (بقرہ پ ۱ ع ۶)	پس افسوس اُن (مدعیانِ علم) پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں تاکہ اس کے معاوضہ میں ایک حقیر سی قیمت دُنیوی فائدہ کی حاصل کریں پس افسوس اس پر جو کچھ وہ لکھتے ہیں اور افسوس اس پر جو کچھ وہ اس ذریعہ سے کماتے ہیں۔
يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (المائدہ پ ۶ ع ۲)	وہ اہلِ کتاب (کتاب اللہ (تورات و انجیل) کے کلمات کو ان کے محل و مقام سے بدل ڈالتے ہیں یعنی تحریفِ لفظی اور معنوی دونوں کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ ثمنِ قلیل (معمولی پونجی) کے عوض آیات اللہ کی فروخت کرنے کے متعلق توبقرہ، آلِ عمران، نساء، توبہ میں متعدد آیات موجود ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ، تورات و انجیل کی بیع دونوں طرح کیا کرتے تھے تحریفِ لفظی کے ذریعہ بھی اور تحریفِ معنوی کے سلسلہ سے بھی۔ گویا سیم و زر کے لالچ سے عوام و خواص کی خواہشات کے مطابق کتاب اللہ کی آیات میں لفظی و معنوی تحریف اُن کے فروخت کرنے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے بڑھ کر شقاوت و بدبختی کا دوسرا کوئی عمل نہیں اور جو ہر حالت میں موجبِ لعنت ہے۔

انجیل اور حواری عیسیٰ علیہ السلام

مفسرین عام طور پر حواری کو "حور" سے ماخوذ کہتے ہیں جس کے معنی کپڑے کی سپیدی کے ہیں جب کپڑا دھل جانے کے بعد سپید ہو جاتا ہے تو اہلِ عرب کہا کرتے ہیں "حار الثوب" اس لیے دھوبی کو "حواری" کہتے ہیں اور "حواریون" اس کی جمع آتی ہے۔ اس معنی کے پیشِ نظر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے شاگردوں کو یا اس لیے حواری کہتے ہیں کہ ان میں سے کئی دھوبی اور مچھیرے کا پیشہ کرتے تھے اور یا اس لیے کہ جس طرح دھوبی کپڑا صاف کر دیتا ہے یہ بھی حضرت مسیح کی تعلیم سے لوگوں کے قلوب کو روشن کر دیا کرتے تھے۔ حواری کے معنی ناصر و مددگار اور ناصح کے بھی آتے ہیں اور عبدالوہاب نجار فرماتے ہیں کہ نصاریٰ حضرت مسیح کے حواریوں کو "شاگرد" کہتے ہیں یہ تعبیر بے اصل نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ اصل کے اعتبار سے "جبور" عبرانی لفظ ہے جس کے معنی "شاگرد" کے ہیں اور اس کی جمع "جبوریم" آتی ہے یہی جبوریم ہے جو عربی میں جا کر حواری اور حواریین کہلایا۔

حوارینِ عیسیٰ (علیہ السلام) کا گذشتہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آچکا ہے لیکن قرآنِ عزیز نے صرف "حواریون" کہہ کر مجمل تذکرہ کیا ہے کسی کا نام مذکور نہیں ہے انجیل نے البتہ ان کے نام بھی بتلائے ہیں اور تعداد بھی، چنانچہ متی کی انجیل کے باب ۱۰ میں بارہ نام شمار کیے ہیں اور چار انجیلوں سے خارج برنابا کی متروک انجیل کے باب ۱۴۲ میں بھی یہی تعداد مسطور ہے البتہ چند ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے نقشہ حسب ذیل ہے:-

انجیل متی		انجیل برنابا	
شمار	نام	شمار	نام
(۱)	پطرس (سمعان)	(۱)	بطرس الصیاد (سمعان)
(۲)	اندراوس پطرس کا بھائی	(۲)	اندراوس
(۳)	یعقوب بن زبدی	(۳)	برنابا

انجیل متی		انجیل برنابا	
شمار	نام	شمار	نام
(۴)	یوحنا (یعقوب کا بھائی)	(۴)	یعقوب بن زبدی
(۵)	فیلپس	(۵)	یوحنا بن زبدی
(۶)	برثولماوس	(۶)	فیلپس
(۷)	توما	(۷)	برثولماوس
(۸)	متی العشار	(۸)	تداوس
(۹)	یعقوب بن حلفی	(۹)	یعقوب بن حلفی
(۱۰)	لباوس (ملقب بہ تداوس)	(۱۰)	یہودا
(۱۱)	سمعان القانوی	(۱۱)	متی العشار
(۱۲)	یہودا اسخریوطی	(۱۲)	یہودا اسخریوطی[1]

دونوں انجیلوں کے درمیان صرف دو ناموں میں اختلاف ہے متی میں توما اور سمعان قانوی ہیں اور برنابا میں ان کی جگہ خود برنابا اور تداوس ہیں، ان میں کون صحیح کہتا ہے؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن دلیل کی روشنی میں یہ کہنا بہت آسان ہے کہ کلیسہ کی کونسل نے بے دلیل اور اور بے سند صرف اس بنا پر برنابا اور اس کے رفیق تداوس کے نام منظور کر دیے کہ ان دونوں کی روایات الوہیتِ مسیحؑ اور کفارہ کے خلاف سچی عیسائیت پر مبنی تھیں اور یہ کلیسہ کے اس عقیدہ کے قطعاً خلاف تھیں جو سینٹ پال کی محرّف عیسائیت کا مقبول عقیدہ تھا اور ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ برنابا کا نام موجودہ عیسائیت میں حواریوں سے خارج سمجھا جاتا ہے تاہم ان رسولوں کی فہرست میں آج بھی موجود ہے جنھوں نے ملکوں میں خدائی بادشاہت کا اعلان کیا اور مسیحی دین کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمِ حق کا خلاصہ گذشتہ بیانات میں

[1] قصص الانبیاء للنجار۔ ص ۴۰۲۔

سپردِ قلم ہو چکا ہے، وہ خدا کے سچے پیغمبر، حق و صداقت کے داعی، دینِ مبین کے ہادی و مبلغ تھے اور خدا کے تمام سچے پیغمبروں کی طرح ان کی تعلیم بھی پہلی صداقتوں کی مؤید اور وقت کی انفرادی و اجتماعی ضروریات کے انقلابات و حوادث کے مناسب حال انجیل کی شکل میں اصلاح و انقلاب کے لیے منادی تھی، توحیدِ خالص، معرفتِ کردگار کے لیے کردگار سے ہی بلا وسیلہ تقرب، محبت و شفقت، رحمت و عفو کی اخلاقی برتری اُن کی پاک تعلیم کا نچوڑ تھا، لیکن انسانی انقلابات کی ذہنی تاریخ میں اِس سے زیادہ حیرت اور تعجب کی غالباً کوئی بات نہ ہو کہ حضرتِ مسیحؑ کی مقدس تعلیم ہی کے نام پر موجودہ مسیحیت، توحید کی جگہ تثلیث، معرفتِ حق کے لیے اِبنیت کا عقیدہ، نجات کے لیے علم و عمل کی درستکاری کی جگہ کفارہ پر ایمان جیسی مشرکانہ اور جاہلانہ بدعات کی تبلیغ اور نشر و اشاعت میں سرگرمِ عمل ہے۔

تثلیث؟ بستانی نے دائرۃ المعارف (ENCYCLOPADIA) میں اس مسئلہ پر مسیحی نقطۂ نظر سے سیر حاصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عیسائی مذہب نے سب سے پہلے تثلیث کا نام رسولوں کے عہد میں سُنا، اس سے قبل مسیحیت اس عقیدہ سے قطعاً ناآشنا تھی اور رسولوں کا عہد سینٹ پال (پولوس رسول) سے شروع ہوتا ہے یہ وہی حضرت ہیں جن کی بدولت دینِ مسیحی نے نیا جنم لیا اور جن کی یہودیت نے ازراہِ تعصب مسیحی صداقت و توحید کے عقیدہ کو دثنیت اور شرک سے آلودہ کر کے کامیابی کا سانس لیا، یہ عقیدہ دراصل دثنی (بت پرستانہ) فلسفہ کی موشگافیوں کی پیداوار اور صنم پرستانہ عقیدہ "اوتار" کی صدائے بازگشت ہے اور اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ذات یا صفاتِ خداوندی بشکلِ انسانی کائناتِ ارضی میں وجود پذیر ہو سکتی ہے گویا یہ عقیدہ فلاسفۂ ہیلانیین اور غنوسطیین کے عقائدِ فلسفیانہ کا ایک معجونِ مرکب ہے چنانچہ تاریخ قدیم سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں انطاکیہ کے بشپ (BUSHAP) تھیوفیلوس نے سب سے پہلے اس سلسلہ میں ایک یونانی کلمہ "ٹریاس" کا استعمال کیا اس کے بعد ایک دوسرے بشپ ترتلیانوس نے اس کے قریب قریب

ایک لفظ تیر نیاس ایجاد کیا، یہی وہ یونانی لفظ ہے جو موجودہ مسیحی عقیدہ "ثالوث (تثلیث) کے مرادف اور ہم معنی ہے۔ اگر اس مسئلہ کی حقیقت کو ذرا اور گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو تاریخی حقائق سے یہ بات نمایاں نظر آئے گی کہ ثالوث کا عقیدہ دراصل مسیحیت اور وثنیت کی اس آمیزش کا نتیجہ ہے جو مسیحیت کے غلبہ اور وثنیت (بت پرستی) کی مغلوبیت کی وجہ سے پیش آیا، خصوصاً جب مصری بُت پرستوں نے اُس مذہب کو قبول کیا تو انھوں نے اس عقیدہ کو بہت ترقی دی اور فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں کے ساتھ اس کو علمی بحث بنا دیا مسیحیت قبول کر لینے کے بعد بُت پرستوں پر جو ردِ عمل ہوا اس کے نتیجہ میں سے ایک اہم بات یہ تھی کہ اُن کی خواہش ہمیشہ یہ رہی کہ وہ کس طرح گذشتہ وثنیت کی موجودہ مسیحیت کے ساتھ مطابقت پیدا کریں؟ تاکہ اس طرح قدیم وجدید دونوں ادیان کے ساتھ ربط قائم رہ سکے، چنانچہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اصنامی تخیل سیراپیز (SERAPIS) سے تثلیثی وحدت کی اصل لی گئی اور ایزیز (ISIS) کی جگہ حضرت مریم (علیہا السلام) کو اور ہورس (HORS) کی حضرت مسیح کو دی گئی" اور اس یونانی اور مصری فلسفیانہ وثنیت کی بدولت موجودہ مسیحیت میں الوہیت مسیح اور تثلیث "کلیسہ" کا مقبول عقیدہ بن گیا۔

یہ عقیدۂ تثلیث ابھی سن طفولیت ہی میں تھا کہ علما نصاریٰ میں اس کے رد و قبول پر معرکۃ الآرا بحثیں شروع ہو گئیں "نیقاد" کی کونسل میں مشرقی گرجاؤں میں اور خصوصی اور عمومی مجالس میں جب بحث نے طول کھینچا تو کلیسہ نے فیصلہ دیا کہ مسئلہ ثالوث (تثلیث) حق اور اس کے خلاف "الحاد" ہے ان ملحد جماعتوں اور فرقوں میں نمایاں فرقہ "ایبونین" ہے جو کہتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) انسانِ محض تھے دوسرا "سابلین" ہے جس کا خیال ہے کہ خدا ذاتِ واحد ہے اور اب، ابن، روح القدس، یہ مختلف صورتیں ہیں جن کا اطلاق مختلف حیثیتوں سے ذاتِ واحد ہی پر ہوتا ہے۔ تیسرا فرقہ "آریوسین" ہے اس کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح اگرچہ "ابن اللہ" ہیں مگر "اب" کی طرح ازلی نہیں ہیں بلکہ کائناتِ بلند و پست سے قبل

"اب" کی تخلیق سے مخلوق ہوا ہے اور اس لیے وہ "اب" سے نیچے اور اس کی قدرت کے سامنے مغلوب و خاضع ہے۔ اور چوتھا فرقہ "مقدونیین" ہے ان کا کہنا ہے کہ "اب" اور "ابن" دو ہی اقنوم ہیں "روح القدس" اقنوم نہیں ہے بلکہ مخلوق ہے۔

کلیسہ نے ان کو اور اسی قسم کے دوسرے فرقوں کو "ملحد" قرار دے کر نیقادی کی کونسل منعقدہ ۳۲۵ء اور قسطنطینہ کی کونسل منعقدہ ۳۸۱ء کے مطابق ثالوث (تثلیث) کو مسیحی عقیدہ کی بنیاد تسلیم کیا اور فیصلہ دیا کہ "اب" اور "ابن" اور "روح القدس" تینوں جُدا جُدا مستقل اقنوم (اصل ہیں) اور عالمِ لاہوت میں تینوں کی وحدت ہی خدا ہے گویا اس طرح ریاضی اور علم ہندسہ کے اٹل اور ناقابلِ انکار بدیہی مسئلہ کے خلاف یا یوں کہیے کہ بداہۃً عقل کے خلاف یہ تسلیم کر لیا کہ "ایک" "تین" ہے اور "تین" "ایک" اور یہ بھی کہا کہ "ابن" ازل ہی میں "اب" سے پیدا ہوا اور "روح القدس" کا صدور بھی ازل ہی میں "اب" سے ہوا ہے اور پھر ۵۸۹ء میں طلیطلہ کونسل نے یہ ترمیم منظور کر لی کہ "روح القدس" کا صدور "اب" سے ہی نہیں بلکہ "اب" اور "ابن" دونوں سے ہوا ہے۔ اس ترمیم کو "لاطینی کلیسہ" نے تو بغیر چون و چرا تسلیم کر لیا اور اُس کو کلیسہ کا عقیدہ بنا لیا لیکن "یونانی کلیسہ" اوّل تو خاموش رہا۔ مگر اس کے کچھ عرصہ کے بعد اس ترمیم کو بدعت قرار دے کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس باہمی اختلاف نے اس قدر شدید صورت اختیار کر لی کہ "یونانی کلیسہ" اور "کیتھولک لاطینی کلیسہ" کے درمیان کبھی اتفاق و اتحاد پیدا نہ ہو سکا۔

ثالوث یا تثلیث کا یہ عقیدہ دینِ مسیحی کے رگ و پے میں خون کی طرح ایسا سرایت کر گیا کہ مسیحی کے بڑے فرقوں رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کے درمیان سخت بُنیادی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس میں اتفاق ہی رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ حیرت ہے یہ بات کہ نوتھر کی جماعت اور اصلاح پسند کلیساؤں نے بھی ایک عرصۂ دراز تک اس کیتھولک عقیدہ کو ہی بغیر کسی اصلاح و ترمیم کے عقیدہ تسلیم کر لیا۔ البتہ تیرھویں صدی

عیسوی میں فرقہ لاہوتی کی اکثریت نے اور جدید فرقوں سوسینیائی، جرمانی، موحدین اور عمومیین وغیرہم نے اس عقیدہ کو نقل و عقل کے خلاف کہہ کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔[1]

یہ ہے مسیحیت میں عقیدۂ تثلیث کی وہ مختصر تاریخ جس سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے کہ دینِ مسیحی کی حقیقی صداقت کی تباہی کا راز اسی الحاد اور مشرکانہ بدعت کے اندر پوشیدہ ہے جو صنم پرستانہ تخیل کا رہینِ منت ہے۔

عقیدۂ ثالوث کیا شے ہے اور "اب" "ابن" "روح القدس" کی تعبیرات کی حقیقت کیا ہے یہ مسئلہ بھی مسیحیت کے اُن مباحث میں سے ہے جن کا فیصلہ کن جواب کبھی نہ مل سکا اور جس قدر اس کو صاف اور واضح کرنے کی کوشش کی گئی اس میں ابہام اور پیچیدگی کا اضافہ ہی ہوتا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جس عقیدہ کو مسیحیت میں اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل تھی وہی "معمہ" بن کر رہ گیا اور قدیم و جدید علماء نصاریٰ کو یہ کہنا پڑا کہ تثلیث میں توحید ہے اور توحید میں تثلیث، یہ مذہب کا ایسا مسئلہ ہے جو دنیا میں حل نہیں ہو سکتا اور دوسرے عالم میں پہنچ کر ہی یہ عقیدہ حل ہوگا۔ اس لیے یہاں اس کو عقل سے سمجھنے کی کوشش کرنا فضول ہے بلکہ خوش عقیدگی کے ساتھ قبول کر لینا ہی نجات کی راہ ہے چنانچہ اواخر انیسویں صدی کے مشہور عیسائی عالم پادری فنڈر نے "میزان الحق" میں یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاہم اس صنم پرستانہ فلسفہ کی جو تشریحات کی گئی ہیں ان کو مختصر طور پر یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کائناتِ ہست و بود کو جس میں ہم بس رہے ہیں "عالمِ ناسوت" کہا جاتا ہے اور ملاءِ اعلیٰ کہ جس کا تعلق عالمِ غیب سے ہے وہ اور اُس سے ماوراء جہاں نہ زمین و زماں کا گذر اور نہ مکین و مکان کا، جہاں سب کچھ ہے لیکن مادیت سے بالاتر اور وراء الوراء ہے اس کا نام "عالمِ لاہوت" ہے تو جب زیر و بالا اور بلند و پست کچھ بھی نہ تھا اور ازل کی غیر محدود وسعت میں "وقت" ایک بے معنی لفظ تھا اُس وقت تین اقنوم[2] تھے "باپ" "بیٹا" "روح القدس" اور ان ہی تین اقانیم کی مجموعی حقیقت کا نام "خدا" ہے۔ رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ اور ان دونوں سے

[1] دائرۃ المعارف البستانی جلد ۶ ص ۳۰۵ کلمہ (ثالوث) [2] اقنوم کے معنی ہیں "اصل"

جدا کلیسۂ شرقی تینوں ہی اس پر متفق ہیں اور اسی کو دینِ مسیحیت کی روح یقین کرتے ہیں اور بڑی جسارت کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ کتابِ مقدس کی تصریحات اسی کا اعلان کرتی ہیں۔

اِس عجوبۂ روزگار عقیدہ نے اِس حد پر پہنچ کر جو نئے نئے مباحث و افکار پیدا کیے اُن کا مطالعہ کرنے سے دیدۂ حیرت اور چشمِ عبرت کے لیے بہت کچھ سامان مہیا ہو جاتا ہے، بڑی بڑی مذہبی کونسلوں، بڑے بڑے کلیساؤں کے بشپوں اور پاپاؤں نے اس عقیدہ کی تشریح میں یہ عجیب و غریب مباحث پیدا کیے کہ "اقنومِ اوّل" باپ سے کس طرح اقنومِ ثانی بیٹے کی ولادت ہوئی اور پھر باپ سے یا باپ اور بیٹے دونوں سے کس طرح اقنومِ ثالث "روح القدس" پھوٹ کر نکلی یا کس طرح اس کا صدور ہوا اور یہ کہ اُن کے باہم نسبت کیا ہے اور اُن کے جُدا جُدا کیا القاب و صفات ہیں جو ایک دوسرے کو آپس میں متمائز کرتے ہیں اور پھر جب یہ تثلیث توحید بن جاتی ہے تو اس کی صفات و القاب کی کیا صورت ہو جاتی ہے، نیز یہ کہ جس کو ہم خُدا کہتے ہیں اس میں تینوں اقانیم برابر کے شریک ہیں یا کوئی ایک پُورا اور دوسرے دو جُزوی حصہ دار ہیں اور جزوی شرکت ہے تو کس نسبت اور تعلق سے ہے؟ غرض خدائے برتر کی مقدس اور پاک ہستی کو معاذ اللہ کمہار کے چاک پر رکھا ہوا برتن فرض کر کے جس طرح اس کو بنایا اور طیار کیا ہے اور توحیدِ خالص کو تباہ و برباد کر کے جس طرح شرک و ترکیب کا نیا سانچہ ڈھالا ہے دُنیائے مذاہب و ادیان کی تاریخ میں ایسا مذہبی تغیر و انقلاب چشمِ فلک نے نہ کبھی دیکھا نہ سُنا ان ھٰذا الشیٔ عجاب۔ بہرحال "باپ" "بیٹا" "روح القدس" کی جُدا جُدا تفصیلات و تشریحات اور پھر وحدت سے ترکیب اور ترکیب سے وحدت کی عجوبہ زا تعبیرات کی ایک بھول بھلیاں ہے جس کا کہیں اور چھور نظر ہی نہیں آتا اور جب کہنے والا ہی لفظی تعبیرات کے علاوہ "حقیقت" سمجھنے سے عاری ہے تو سُننے والا کیا خاک سمجھ سکتا ہے۔

باپ اقانیم ثلاثہ میں "اب" پہلا اقنوم ہے۔ اِسی سے اقنومِ ثانی کی ولادت ہوئی اور عالمِ لاہوت میں یہ کبھی بھی دوسرے اور تیسرے اقانیم سے جُدا نہیں ہوتا، مگر مسیحی فرقوں میں کنیسہ

کی عام تعلیم کے مطابق اکثر فرقے یہ کہتے ہیں کہ وحدتِ لاہوت میں تینوں کا درجہ مساوی ہے اور کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں ہے اور آریوسی کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ دوسرا اقنوم "بیٹا" اقنوم اوّل کی طرح ازلی نہیں ہے البتہ عالمِ بالا و پست سے غیر معلوم مُدت پہلے اقنومِ اوّل سے پیدا ہوا ہے اس لیے اس کا درجہ "باپ" کے بعد اور اس سے کم ہے اور مقدونی فرقہ کہتا ہے کہ صرف دو ہی اقنوم ہیں "باپ" اور "بیٹا" اور "رُوح القدس" مخلوق ہے اور فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس کا پایہ تمام ملائکۃ اللہ سے بلند ہے اور طلیطلہ کی کونسل کا فیصلہ یہ ہے کہ روح القدس "باپ" اور "بیٹا" دونوں سے پھوٹ کر نکلی ہے یا دونوں سے ہی اس کا صدور ہوا ہے مگر قسطنطنیہ کی کونسل روح القدس کو صرف باپ ہی سے صادر ہونا بتلاتی ہے اور قدیم و جدید فرقوں میں سے ایک بڑی جماعت اقنوم ثالث مریم (علیہا السلام) کو تسلیم کرتی اور روح القدس کے اقنوم ہونے کا انکار کرتی ہے۔

بیٹا | عربی میں "ابن" فرنچ میں "فی" ـــــ اور انگریزی میں سن (SON) اور اردو میں "بیٹا" کہتے ہیں، یہ اس شکلِ انسانی پر بولا جاتا ہے جو عام قانونِ قدرت کے مطابق مرد و عورت کے جنسی تعلقات کا نتیجہ ہوتا ہے مگر عقیدۂ ثالوث کے مُطابق وہ عالمِ لاہوت میں "باپ" سے جُدا بھی نہیں ہے اور پیدا بھی ہے اور پھر بعض کے نزدیک اس کی پیدائش ازلی ہے اور بعض کے نزدیک غیر ازلی، آگے چل کر کہتے ہیں کہ جب "باپ" کی مشیت کا فیصلہ ہوا تو اقنوم ثانی "بیٹا" عالمِ ناسوت (کائناتِ ہست و بود) میں مریم کے بطن سے پیدا ہو کر "مسیح" کہلایا اور بعض کا تو یہ دعویٰ ہے کہ خود باپ ہی عالمِ ناسوت میں بیٹا بن کر مریم کے بطن سے تولد ہوا اور مسیحؑ کی شکل میں روشناس ہوا اور طرفہ تماشا یہ کہ بعض کے نزدیک تو اقنومِ ثانی "ابن" کو اقنومِ اوّل "اب" پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔

روح القدس | اسی طرح "روح القدس" کے متعلق بھی سخت اختلاف ہے: کوئی کہتا ہے کہ وہ اقنوم ہی نہیں ہے اس لیے عالمِ لاہوت میں اس کو الوہیت حاصل نہیں ہے چنانچہ

مکدونی اور آریوسی کہتے ہیں کہ وہ ملائکۃ اللہ میں سے ہے اور اُن میں سب سے برتر و بلند ہے اور مارا تونیوس کہتا ہے کہ رُوح القدس کی تعبیر مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ کے افعال پر مجازاً اس کا اطلاق کیا جاتا ہے ورنہ الگ سے کوئی حقیقت نہیں ہے اِس بنا پر اس قول کے قائلین کو "مجازئین" کہا جاتا ہے اور علماءِ جدید میں کلارک کہتا ہے کہ الہامی کتابوں عہدنامۂ قدیم و جدید میں کسی ایک جگہ بھی "الوہیت" کا درجہ نہیں دیا گیا، فرقۂ مکدونی نے الوہیتِ روح القدس کا انکار کرتے ہوئے شد و مد سے یہ کہا ہے کہ اگر جوہرِ الوہیت میں رُوح القدس کو بھی دخل ہوتا تو یا وہ مولود ہوتی یا غیر مولود، اگر مولود ہے تو اس کے اور "ابن" کے درمیان کیا فرق رہا اور اگر غیر مولود ہے تو اس کے اور "اب" کے درمیان کیا امتیاز ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسری جماعتیں کہتی ہیں کہ "روح القدس" کو بھی الوہیت حاصل ہے۔ یوسیوس رومانی کہتا ہے کہ روح القدس کا صدور "اب" اور "ابن" دونوں سے ہوا اور وہ اُنکے جوہرِ نفس سے ہے اور دونوں کے ساتھ وحدتِ لاہوت میں "الٰہ" ہے اور اثناسیوس کہتا ہے کہ روح القدس کی الوہیت ناقابلِ انکار ہے اور کتبِ سماویہ میں روح پر "الٰہ" کا اور "الٰہ" پر "روح" کا اطلاق ثابت و مُسلّم ہے اور اس کی جانب ان ہی اُمور کی نسبت کی گئی ہے جن کا تعلق ذاتِ خدا کے ماسوا اور کسی سے نہیں ہے مثلاً تقدیسِ ذات، معرفتِ جمیع حقائق وغیرہ اور یہ عقیدہ قدیم سے چلا آتا ہے جیسا کہ نظم و سوبیا سے ثابت ہے جس کی قدامتِ تالیف سب کے نزدیک مُسلّم ہے اس میں الوہیتِ رُوح القدس کا اعتراف موجود ہے اور مولٹ لفیلو پیٹرس نے انکارِ الوہیتِ روح پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ نصاریٰ کے نزدیک خدائے حقیقی کی توحید کا تثلیث میں مُضمر ہونا ایک مُسلّم حقیقت ہے پھر رُوح کو الوہیت سے خارج کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور مکدونیوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مارا ثناسوس کہتا ہے کہ کتبِ سماوی میں روح کو ابن نہیں کہا گیا بلکہ روح الاب ہا

اور روح الابن کے اطلاقات پائے جاتے ہیں لہٰذا اس کو "ابن" یا "اب" کہنا صحیح نہیں اور نہ اس کو الوہیت سے نکال کر مخلوق کہنا درست ہو سکتا ہے اور ادراکِ بشری عاجز ہے کہ ان فلسفیانہ بحثوں سے "روح القدس" کی حقیقت تک پہنچ سکے البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقط تولید (پیدا ہونا) ہی تنہا ایسا واسطہ نہیں ہے جو "اب" کے ساتھ قائم ہو بلکہ انبثاق (صدور یا پھوٹ نکلنا) بھی ایک شکل ہو سکتی ہے مگر ہم اس دنیا میں تولید و انبثاق کے درمیان فرق ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہیں البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ تولید و انبثاق دونوں کا "اب" کے ساتھ ازلی و ابدی اور تلازم کا تعلق ہے پس ہمارے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ فلاسفۂ قدیم (فلاسفۂ یونان) کی طرح "روح القدس" اور "اب" کے درمیان فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعہ وہ اعتقادات قبول کر لیں جو انھوں نے خدا سے صدورِ ارواح کے متعلق پیدا کر لیے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ وہ اختلافات بھی پیشِ نظر رہنے چاہئیں جو گذشتہ سطور میں بیان ہو چکے ہیں کہ بعض کلیسہ "روح القدس" کا فقط اقنومِ اوّل (باپ) سے صادر ہونا مانتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ "باپ" اور "بیٹا" دونوں سے اس کا صدور ہوا ہے، یہ اختلاف بھی عیسائی فرقوں کے درمیان سخت کشاکش کا سبب رہا ہے کیونکہ ۳۸۱ء میں منعقدہ کونسل قسطنطنیہ نے "منشورِ ایمانی" میں یہ واضح کر دیا تھا کہ روح القدس کا صدور "باپ" ہی سے ہوا ہے اور عرصہ تک یہی عقیدہ مسیحی دنیا میں نافذ رہا لیکن ۴۴۶ء میں اوّل ہسپانیہ کے کلیسہ نے پھر فرانس کے کلیسہ نے اور اس کے بعد تمام لاطینی رومن کلیساؤں نے اس ترمیم کو جزوِ عقیدہ بنایا کہ "روح القدس" کا صدور اقنومِ اوّل (باپ) اور اقنومِ ثانی "بیٹا" دونوں سے ہوا ہے، عیسائی علماء کہتے ہیں کہ دراصل یہ بحث ۸۶۶ء میں سب سے پہلے شرق کے بطرق فوتیوس نے اس لیے پیدا کی کہ اس کی اور اس کی جماعت کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح شرق (یونان) کے کلیسہ کو غرب (روم) کے کلیسہ سے جدا کر دیا جائے اور مشرق و

مغرب کے کلیساؤں کا اتحاد باقی نہ رہنے دیا جائے اسی خیال کی تائید و تقویت کے لیے ۱۰۴۳ء میں بطریق میخائیل کرولاریوس نے اس عقیدہ کو بہت جلد شائع کیا اور آخر کار صدیوں تک اِن اختلافات نے کلیسہ ہائے مشرق و مغرب کے درمیان مخالفانہ کش مکش کو قائم رکھا اور دونوں کلیسہ ایک دوسرے پر یہ الزام قائم کرتے رہے کہ مخالف کلیسہ نے مسیحیت میں الحاد و بدعت کی آمیزش کر کے حقیقی مذہب کو مٹا ڈالا ہے اور رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کی بالعموم اور کلیساؤں کے مختلف فرقوں کی بالخصوص کش مکش کا یہ سلسلہ اُس وقت تو انتہائی شدت اختیار کر چکا تھا اور باہم ہولناک خونریزیوں اور بہیمانہ مظالم کا جہنم بن چکا تھا جبکہ اسلام اعتقادات کی سادگی، اعمالِ صالحہ کی پاکیزگی اور اپنی علمی و عملی روحانیت کی شگفتگی کی بدولت "امنِ عام" اور "رحمت" کا نیّرِ درخشاں بنا ہوا تھا۔

ازمنۂ مظلمہ اور اصلاحِ کنیسہ کی آواز

یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائیوں کے مذہبی کلیسہ معمولی معمولی اختلافات کی بناء پر پوپ کی حکومت اور پیروانِ پوپ کی حکومتوں کے ذریعہ ایک دوسری جماعت کو گردن زدنی اور کشتنی قرار دیتی اور ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو وحشتناک عذابوں میں مبتلا کر کے قتل کر دیا کرتی تھیں اِسی بناء پر مؤرخین تاریخ کے اس دور کو ازمنۂ مظلمہ (زمانہائے تاریک) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

قرآن نے حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے متعلق جس حقیقت اور صداقت کا اظہار کیا تھا پوپ اور کلیسا سے مرعوبیت نے اگرچہ ایک مدتِ مدید تک عیسائیوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا۔ مگر پھر بھی یہ صدائے حق اثر کیئے بغیر نہ رہ سکی، اس کی تفاصیل اگرچہ خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں مذکور ہوں گی لیکن یہاں صرف اس قدر اشارہ کرنا مقصود ہے کہ رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ اور دوسرے فرقوں نے بغیر کسی جھجک کے سینٹ پال کی تحریف (تثلیث) مسیحیت کا بُنیادی عقیدہ تسلیم کر لیا تھا اور اگرچہ بعض چھوٹی چھوٹی جماعتوں یا افراد نے کبھی کبھی اس کے خلاف آواز اُٹھائی۔ مگر وہ آواز

دَب کر رہ گئی اور نقار خانہ میں طوطی کی صدا سے زیادہ اس کی حیثیت نہ بن سکی مثلاً ۳۲۵ء اور ۳۸۱ء میں جب نیقادی کونسل اور قسطنطنیہ کونسل نے تثلیث کو دینِ مسیحی کی بنیاد قرار دیا اس وقت ابوبیئین نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ حضرت مسیحؑ صرف انسان ہیں اور الوہیت کا اُن سے کوئی علاقہ نہیں اور سابلیئین کہتے تھے کہ اقانیم ثلاثہ تین مختلف جوہر نہیں ہیں بلکہ وحدتِ لاہوتی کی مختلف صورتیں اور تعبیریں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ صرف اپنی ذاتِ واحد کے لئے اطلاق کرتا ہے تاہم اس وقت تک چونکہ پوپ اور کلیسہ کے فیصلے خدائی فیصلے سمجھے جاتے تھے اور بشپ اور پاپا "اربابا من دون اللہ" یقین کیے جاتے تھے اِس لیے ان اصلاحی آوازوں کو "الحاد" کہہ کر دبا دیا گیا۔ مگر جب صلیبی جنگوں نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے اتنے قریب کر دیا کہ انھوں نے اسلام کے اعتقادی اور عملی نظام کا بہت کچھ نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسلام سے متعلق بَطارِقہ (BATARIQA) بَساقِفہ (BISHAQIFA) کی غلط بیانی اور بہتان اُن پر ظاہر ہونے لگی تب اُن میں بھی آزادیٔ فکر نے کروٹ لی اور کورانہ تقلید کو شکست و ریخت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا چنانچہ لوتھر کی آواز پہلی صدائے حق تھی جس نے جرأت کے ساتھ "اربابا من دون اللہ" کے بُتوں کو ماننے سے انکار کر دیا اور پوپ کے مقابلہ میں کتابِ مقدس کی پیروی کی دعوت دی مگر آپ کو تعجب ہوگا یہ سُن کر کہ پوپ کی جانب سے لوتھر کے خلاف جو الحاد اور بد دینی کے الزامات لگائے گئے تھے اُن میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ یہ در پردہ مسلمان ہو گیا ہے اور پاپا کے خلاف اس کی صدا قرآن کی صدائے بازگشت ہے۔

بہر حال یہی وہ صدائے اصلاح تھی جو بلاشبہ اسلام کی دعوت تفکر و تعقل سے متاثر ہو کر آہستہ آہستہ "اصلاح کنیسہ" کے نام سے مسیحی دنیا میں گونج اٹھی اور آگ کی طرح ہر طرف اس کے شعلے نظر آنے لگے ان ہی اصلاحات میں سے ایک اہم اصلاحی تخیل یہ بھی تھا کہ عقیدۂ تثلیث کتاب مقدس (عہد نامۂ جدید) کے قطعاً خلاف ہے چنانچہ تیرھویں صدی

عیسوی میں قدیم لاہوتی فرقہ کے جمہور نے نسطوری فرقہ کے جماعتی فیصلہ نے اور جدید جماعتوں میں سے سوسینیانیں ـــــ جرمانیں ـــــ موحدین ـــــ اور عمومیین اور دوسری جماعتوں نے تعلیم کلیسا کے خلاف مذہبی بغاوت کرتے ہوئے صاف کہدیا کہ تثلیث کا عقیدہ نقل وعقل دونوں کے خلاف اور ناقابل تسلیم ہے اور اگرچہ قومی ومذہبی عصبیت نے ان کو اسلامی عقیدہ کا پیرو ہونے سے باز رکھا تاہم انھوں نے عقیدۂ تثلیث کی مختلف شکلوں کے ساتھ ایسی تعبیرات کرنی شروع کردیں جس سے عقیدۂ ثالوث باطل ہوکر توحیدِ الٰہی کے پاک اور مقدس جراثیم پیدا ہونے لگے مثلاً سوئڈنبرگ نے کہا:۔

"اقانیم ثلاثہ "باپ" "بیٹا" "روح القدس" کا تعلق حضرت مسیح کی ذات کے ماسوا ذاتِ احدیت سے نہیں ہے یعنی مسیح کی ذات اپنی طبع لاہوتی کے پیشِ نظر "باپ" ہے اور عالمِ ناسوت میں انسانی شکل کی تقیید کی وجہ سے "بیٹا" اور "اقنوم ثانی" ہے اور اس حیثیت سے کہ روح القدس کا صدور اس سے ہوا ہے وہ اقنوم ثالث "روح" ہے غرض "ثالوث" کا تعلق صرف حضرت مسیح سے ہے اور کانٹ (CANT) کہتا ہے کہ عقیدۂ ثالوث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ "باپ" "بیٹا" "روح القدس" بلکہ یہ عالمِ لاہوت میں خدائے برتر کی تین بنیادی صفات کی جانب اشارہ ہے جو باقی تمام صفات کے لیے مصدر اور منبع کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ "قدرت" (اب) حکمت (ابن) اور "محبت" (روح) ہیں یا اللہ کے ان تین افعال کی جانب اشارہ ہے جو "خلق" "حفظ" اور "ضبط" کے نام سے بھی تعبیر کیے جاتے ہیں اور ہیکن اور شیلنگ نے اس خیال کی کافی اشاعت کی کہ عقیدۂ ثالوث حقائق کی طرح کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ ایک تخیلی نظریہ ہے ان کی مراد یہ ہے کہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے خدائے برتر کی ذاتِ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور مسیح علیہ السلام، مخلوقِ خدا، لیکن عام خیال وتصور میں جب ہم لاہوتی عالم کی جانب پرواز کرتے ہیں تو ہمارا خیال اس عالم میں خدا مسیح اور روح القدس کو "اب" "ابن" اور "روح" کی تعبیرات دیتا اور ان کے باہم تعلق کو اقانیم ثلاثہ کی حیثیت میں دیکھتا ہے۔

"عقلیین" "لوتھریین" اور "موحدین" اور "جرمانیین" کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں جو سابقین کے عقیدہ کو اختیار کرکے ایک بڑی جماعت کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یورپ کی نشاۃ جدیدہ میں بھی عام طور پر تمام کلیساؤں کا ثالوث (تثلیث) پر ہی عقیدہ ہے اور ان کے نزدیک اس کلمہ کی تعبیر وہی ہے جو چوتھی صدی عیسوی میں متعدد مذہبی کونسلوں نے کی اور جو بلاشبہ شرک جلی اور توحید کے یکسر منافی ہے۔

قرآن اور عقیدۂ تثلیث نزولِ قرآن کے وقت جمہورِ مسیحی جن بڑے فرقوں میں تقسیم تھے ثالوث کے متعلق ان کا عقیدہ تین جُدا جُدا اصولوں پر مبنی تھا، ایک فرقہ کہتا تھا کہ مسیح عینِ خدا ہے اور خدا ہی بشکلِ مسیح دنیا میں اُتر آیا ہے اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ مسیح ابن اللہ (خدا کا بیٹا ہے) اور تیسرا کہتا تھا کہ وحدت کا راز تین میں پوشیدہ ہے۔ باپ، بیٹا، مریم اور اس جماعت میں بھی دو گروہ تھے اور دوسرا گروہ حضرتِ مریمؑ کی جگہ "روح القدس" کو اقنومِ ثالث کہتا تھا غرض وہ حضرتِ مسیحؑ کو ثالثِ ثلاثہ (تین میں کا تیسرا) تسلیم کرتے تھے اس لیے قرآن کی صدائے حق نے تینوں جماعتوں کو جُدا جُدا بھی مخاطب کیا ہے اور یکجا بھی اور دلائل و براہین کی روشنی میں مسیحی دنیا پر یہ واضح کیا ہے کہ اس بارہ میں راہِ حق ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مسیح مریمؑ کے بطن سے پیدا شدہ انسان اور خدا کا سچا پیغمبر اور رسول ہے، باقی جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ باطلِ محض ہے ——— خواہ اس میں تفریط ہو جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ العیاذ باللہ وہ شعبدہ باز اور مفتری تھے یا افراط ہو جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ وہ خدا ہیں اور خدا کے بیٹے ہیں یا تین میں کے تیسرے ہیں۔

قرآن عزیز نے صرف یہی نہیں کیا کہ نصاریٰ کے تردیدی پہلو کو ہی اس سلسلہ میں واضح کیا ہو بلکہ اس کے علاوہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی شانِ رفیع کی اصل حقیقت کیا ہے اور عند اللہ ان کو کیا قربت حاصل ہے اس پر بھی نمایاں روشنی ڈالی ہے تاکہ اس طرح

دلے عقیدہ کی بھی تردید ہو جائے اور افراط و تفریط سے جُدا راہِ حق آشکار نظر آنے لگے۔

حضرت مسیحؑ خدا کے مُقرب اور برگزیدہ رسُول ہیں

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا (مریم پ ع)

مسیحؑ نے کہا "بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھ کو نبی بنایا ہے اور مجھ کو مُبارک ٹھہرایا جہاں بھی میں رہوں اور اس نے مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی جب تک بھی زندہ رہوں اور اس نے مجھ کو میری والدہ کے لیے نیکوکار بنایا اور مجھ کو سخت گیر اور بدبخت نہیں بنایا مجھ پر سلامتی ہو جب میں پیدا ہوا جب میں مرجاؤں اور جب حشر کے لیے زندہ اٹھایا جاؤں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (زخرف پ ع)

وہ (مسیحؑ) نہیں ہے مگر ایسا بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور میں نے اس کو مثال بنایا ہے بنی اسرائیل کے لئے، اور اگر ہم چاہتے تو کر دیتے ہم تم میں سے فرشتے زمین میں چلنے پھرنے والے اور بلاشبہ وہ (مسیحؑ) نشان ہے قیامت کے لیے پس اس بات پر تم شک نہ کرو اور میری پیروی کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ (ع)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰؑ بن مریمؑ نے کہا اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں تصدیق کرنیوالا ہوں جو میرے سامنے ہے تورات اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے